اہل علم وانصاف
کی خدمت میں ایک اہم پیش کش

حقائق تحریک بالاکوٹ

تالیف

محقق دوراں
حضرت علامہ مولانا سید شاہ حسین گردیزی

ناشر
ضیاء العلوم پبلی کیشنز
راولپنڈی۔ پاکستان

حقائق تحریک بالاکوٹ

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی۔ پاکستان
0333-5166587 Fax-4580404

نام کتاب: **حقائق تحریک بالاکوٹ**

مؤلفہ: حضرت علامہ مولانا **شاہ حسین گردیزی**

پروف ریڈنگ: مولانا سید **عظمت حسین شاہ گیلانی**

کمپوزنگ: **ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر** سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: **قاضی محمد یعقوب چشتی**

بار طبع: دوئم دسمبر 2009ء

قیمت: 140.00

ناشر: **ضیاء العلوم پبلی کیشنز** یو 128 بازار نلواڑاں راولپنڈی
0333-5166587 Fax-4580404

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور اردو بازار کراچی
فرید بک سٹال اردو بازار لاہور
مکتبہ غوثیہ محلہ فرقان آباد سبزی منڈی کراچی
مکتبہ رضویہ نزد ستا ہوٹل گنج بخش روڈ لاہور
اسلامک بک کارپوریشن اقبال روڈ راولپنڈی Ph:051-5536111
احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک راولپنڈی

ضروری التماس

قارئین کرام! ہم نے اپنی بساط کے مطابق اس کتاب کے متن کی تصحیح میں پوری کوشش کی ہے۔ تاہم پھر بھی آپ اس میں کوئی غلطی پائیں تو ادارہ کو آگاہ ضرور کریں تاکہ وہ درست کردی جائے۔ ادارہ آپ کا بے حد شکرگزار ہوگا۔

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو مہر ثانی حضرت خواجہ سید
غلام نصیر الدین شاہ گولڑوی دامت نور اللہ مرقدہ کے
اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں جن کے سایہ مژگان
میں داماندگانِ دہر، گم کردگانِ راہ اور تشنگانِ علم کے
لئے آسودگی ، رہنمائی اور فیض و برکت کے ٹھنڈے
اور میٹھے دریا بہتے رہے۔

شاہ حسین گردیزی

حضرت پیر کرم شاہ الازہری

(جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

برصغیر میں گذشتہ ڈیڑھ دوسو سال کے دوران سیاست، مذہب اور اصلاح کے نام پر کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ جنہوں نے برصغیر کی تاریخ پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کی ''تحریک اصلاح جہاد'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی اس تحریک پر ماضی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ مصلحت کوشی اور عقیدت کیشی نے مؤرخین کے ایک طبقہ کو بھی اسی سلسلہ میں تاریخی حقائق کے اظہار و بیان سے دانستہ یا نادانستہ معذور کر دیا اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی اہل ہمت آگے بڑھ کر تاریخی صداقتوں کے حسین چہرہ سے گرد و غبار صاف کر دیتا یا مجبوریوں کا نقاب الٹ دیتا۔

مجھے خوشی ہے کہ یہ سعادت علامہ شاہ حسین گردیزی کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے تحریک بالاکوٹ اور اس کے رہنماؤں سے متعلق حقائق کو جس طرح منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ انداز بیان دلنشین اور مدلل ہے جس سے اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تحریک بالاکوٹ کا حقیقی رخ جاننے کیلئے محقق نوجوان علامہ شاہ حسین گردیزی کی کتاب ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' انتہائی مفید ثابت ہوگی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کئے بغیر تحریک بالاکوٹ کی حقیقت تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

مصلحت و عقیدت کے دبیز پردوں میں چھپائے گئے حقائق کو ''روشنی'' اور ''زبان'' عطا کر کے علامہ گردیزی نے قابل ستائش کارنامہ انجام دیا ہے مجھے امید ہے کہ کتاب اہل علم میں کما حقہ پذیرائی حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے حبیب مکرم ﷺ کے طفیل علامہ گردیزی کو اجر عظیم سے نوازے اور ان کے علم اور قلم میں برکت عطا کرے۔ آمین ثم آمین!

حکیم نصیر الدین ندوی

(فاضل ندوة العلماء لکھنو بھارت)

ہمارے مخلص ومہربان وکرم گستر حضرت مولانا شاہ حسین صاحب گردیزی نے ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' کے نام سے جو کتاب مرتب فرمائی ہے وہ اپنی عبارت کی دلنشینی، بیانات کی رنگینی اور حقائق کی دلآویزی کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔اس کتاب میں ان تاریخی حقائق کو پوری صحت کے ساتھ منظر عام پر لایا گیا ہے جن پر نقاب ڈال دی گئی ہے اور یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کے عقیدت مندوں نے ان دونوں مجاہدانِ آزادی کو جس طرح انگریزوں کے ساتھ جہاد میں لاکھڑا کیا ہے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور یہ دونوں نامور مجاہد انگریزوں کے خلاف میدان جہاد میں اترے ہی نہیں بلکہ خود انگریزوں کے اشارہ پر سکھوں اور مسلمانوں سے نبرد آزما رہے۔

ع از ابتدائے معرکہ او درمیان نبود

یہ دونوں انگریزوں کے حلیف تھے حریف نہ تھے۔

اس کتاب میں سب سے بڑا کام یہ کیا گیا ہے کہ موجودہ عہد کے ایک نام نہاد مؤرخ غلام رسول مہر کی ''تاریخی تحریفات'' کی مکمل نقاب کشائی کر دی گئی ہے اور دنیا کو بتلا دیا گیا ہے کہ یہ مؤرخ شہیر اپنے مداحوں کو کس شہرت وعظمت کے بام بلند اور شہادۃ عظمٰی کے مرتبہ عالی پر لا پہنچایا ہے اور تاریخ میں کیسی کیسی تحریفات بہ کمال جرات وجسارت کرنے کا خوگر ہوگیا ہے۔

حضرت گردیزی نے پوری تاریخی تفتیش کے بعد یہ بات ثابت کر دی ہے کہ

سید احمد بریلوی دولت علم سے یکسر محروم تھے اور اس کیساتھ ہی عقل ودانش سے بھی کلیۃ کورے تھے۔ یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد سید احمد بریلوی کا قصور بہت کم رہ جاتا ہے اور اسمٰعیل دہلوی سرتاپا ہر عیب میں متہم نظر آتے ہیں اس لئے کہ اسمٰعیل دہلوی اعوجاج فکری میں مبتلا تھے اور گروہ سفہاء میں تعلیم یافتہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ اسی کمال جہل کی بناء پر وہ امکان نظیر ﷺ کے قائل ہو گئے اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے منہ آ گئے۔ نتیجہ انہیں شکست فاش ہوئی اور اب تک کسی سے ''امتناع النظیر [ا]'' کا جواب نہ ملا۔

جس ''باب نبوۃ'' کو اسمٰعیل دہلوی نے اپنی نادانی سے کھولا تھا اسے علامہ فضل حق نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اور دلائل قطعیہ سے یہ بات ثابت کر دی کہ حضرت سرور رسالت ﷺ کا مثیل ونظیر اس کائنات میں اب کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

ا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی شہید کالا پانی کی تصنیف کا نام ہے۔ مرتب۔

خواجہ رضی حیدر!

قائداعظم اکیڈمی کراچی!

تحریک بالاکوٹ جسے تاریخ کے صفحات میں ''جہاد آزادی'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنے اندر بے پناہ کشش اور پراسراریت رکھتی ہے۔ کشش ان معنی میں کہ جس دور میں یہ تحریک منظر پر آئی وہ اسلامیانِ ہند کیلئے ابتلاء اور آزمائش کا بدترین دور تھا اور نفسیاتی صورت حال اس قدر بگڑ چکی تھی کہ وہ ہر چمکدار چیز کو سونا تصور کرتے تھے۔ مذہب وملت کے نام پر نہ صرف ان کو بآسانی شیشے میں اتار لیا جاتا بلکہ نامعلوم مقاصد کیلئے استعمال بھی کرلیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تحریکات میں اس دور کے نہ صرف عوام الناس بلکہ باشعور افراد بھی بلاتحقیق مقاصد شامل ہوجاتے اور بعد میں یا تو کنارہ کشی اختیار کرلیتے یا گوشہ نشینی۔ یہ صورتِ حال اسلامیانِ ہند کی نمائندہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام تک برقرار رہی اور پھر رفتہ رفتہ سمتِ سفر کا تعین ہوتا چلا گیا۔ پراسرار اس لئے کہ اس تحریک کے معینہ مقاصد اور تمام پہلو آج تک پردہ خفا میں ہیں۔

یوں تو تحریک بالاکوٹ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جارہا ہے لیکن اس موضوع پر تمام کتابیں تجزیہ سے محروم اور جذباتی طرز نگارش کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا جعفر تھانیسری کی سوانح احمدی سے لے کر سال رواں کی درسی کتب تک یک طرفہ مندرجات آکاس بیل کی مانند تاریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اس صورت حال میں مخفی حقائق کو سامنے لانے کی جسارت کرنا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

تحریک بالاکوٹ اور اس سے متعلق افراد و واقعات کا یقیناً پاکستان کی نظریاتی

اساس و بنیاد سے کوئی بالواسطہ تعلق نہیں۔ اس لئے اس تحریک کی خامیوں اور اس کے منفی اثرات و معنویت کی نشاندہی وطن دشمنی نہیں بلکہ صحتمندانہ تاریخی رویہ ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں تاثر کو تجزیہ کا نعم البدل تصور کرلیا جائے۔ وہاں بھٹکنے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ مولانا شاہ حسین گردیزی نے تحقیق و تفتیش کے بعد ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' میں اس تحریک کے متعدد نئے پہلو پیش کئے ہیں جن سے روائتی انداز فکر کی بھرپور نفی ہوتی ہے۔ اگرچہ ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' سے ممدوحسین کا حلقہ چراغ پا ہوگا لیکن سنجیدہ علمی طبقہ میں اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

دراصل تاریخ کی لامحدود پیچیدگیوں کو صرف چند مضامین یا کچھ کتابیں لکھ کر سلجھایا نہیں جا سکتا۔ ایک صدی کے دوران پیدا شدہ فکری مغالطوں کی قطع و برید ایک مسلسل اور طویل عمل چاہتی ہے۔ تحریک بالاکوٹ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو روحانی حیثیت دینے کی عمداً کوشش کی گئی ہی۔ مولانا شاہ حسین گردیزی نے اسی روحانی لبادہ کے اندر جھانکنے کی جسارت کی ہے اور یقیناً ان کے اس عمل سے اعتماد و اعتبار کی اس عمارت کو شدید دھچکا لگے گا جس کی تعمیر میں مکر و ریا کی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ اس عمل سے شور بھی مچے گا اور فرقہ واریت کو ہوا دینے کا روایتی الزام بھی عائد کیا جائے گا لیکن مولانا شاہ حسین گردیزی کا یہ کارنامہ ہمیشہ اجتہادی حیثیت کا حامل رہے گا۔

پروفیسر منیب الرحمٰن

علامہ اقبال کالج کراچی

مولانا شاہ حسین گردیزی کی تصنیف ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' نظر سے گزری۔ مصنف ماشاءاللہ صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کی تحریر میں سلاست وروانی، شستگی اور متانت نمایاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر دستیاب تمام تر مطبوعہ تاریخی مواد کا کافی دقت نظر اور دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا ہے اور یہ ان کا کمال ہے کہ ایک خالص تاریخی وتحقیقی موضوع کو اس قدر دلکش ترتیب اور منفرد انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہی کسی مصنف اور صاحب تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہوسکتی ہے کہ اگر کسی قاری کی اس کی تحریر پر ایک نگاہ غلط انداز سے بھی پڑ جائے تو وہ اس سے آنکھیں چار کئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے۔

زیر نظر کتاب جہاں تک میں نے مطالعہ کیا اس کے تمام تر مندرجات باحوالہ ہیں اور ان حوالہ جات کے مآخذ ان حضرات کی کتب اور نگارشات ہیں جو رہنمایان تحریک بالاکوٹ سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے اور جو عوام میں ایک مؤرخ کے طور پر معروف ہیں۔

مصنف کا اس میں جو حصہ یا contribution ہے وہ ان کا مخصوص انداز ترتیب، تنقیدی زاویہ نظر کے باوجود ایک واقعاتی تصویر وتشکیل اور واقعات کی تہہ میں پوشیدہ حقائق، سرسری اور سطحی رخ کے پیچھے مستور خدوخال، حوالہ جات پر تمہیدی کلمات اور حوالہ جات سے اخذ کردہ نتائج ہیں۔ گویا انہوں نے عقیدتمندوں کی عقیدت کے ''میک اپ'' کو شخصیات کے چہروں سے اتار پھینکا ہے تاکہ غازہ اترنے

کے بعد جو صحیح تصویر ابھرتی ہے وہ قادری کے سامنے نمایاں ہو جائے اور اسے اس جانب مائل کیا جائے کہ وہ اس واقعہ کے ''روایتی ہیولیٰ'' کو ذہن سے محو کر کے صحیح تصویر ''لوحِ قلب'' پر نقش کرے۔ بس مجھے یہی مصنف کا مشن اور مقصد تحریر نظر آتا ہے اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

میں مصنف کے اس رویہ کی ضرور داد دوں گا کہ زیر بحث شخصیات اور ان کے مکتبہ فکر سے سنگین اختلاف کے باوجود، جو عیاں ہے۔ انہوں نے متانت و سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، شخصی احترام کو ملحوظ رکھا ہے، شخصیات کے حوالہ سے الفاظ کے استعمال میں احتیاط سے کام لیا ہے اور علمی و تحقیقی روش کو قائم رکھا ہے اور ایسے موضوعات پر کام کرنے والے تمام حضرات کو اس رویہ کی تقلید کرنی چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کو ''تلاش حق'' کی جانب مائل کرے گی اور اگر ایسا ہوا تو مصنف کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اللہ رب العزت سب کو ایسی ''چشم بصیرت'' عطا فرمائے جو حقیقت کو ہزار پردوں میں مستور ہونے کے باوجود بھانپ سکے اور پروپیگنڈے، ملمع کاری، ظاہری چکاچوند اور الفاظ و انداز کی زیب و زینت سے مسحور نہ ہو۔

پروفیسر محمد افضل جوہر

(عبداللہ ہارون کالج کراچی)

جب انگریز نے ہندوستان میں قدم جمانے کی کوشش کی تو سب سے پہلے انگریز کے خلاف جس نے علم جہاد بلند کیا۔ اسے سلطان حیدر علی (متوفی ۱۷۸۲ء) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں نے سلطان کی موت پر گھی کے چراغ جلائے۔ مگر سلطان کے فرزندار جمند سلطان ٹیپو نے اپنے والد ماجد کے مشن کو زندہ رکھا اور انگریز کے سامنے سینہ سپر رہا اور سات برس تک انہیں پریشان رکھا۔ آخر اپنوں کی غداری کے باعث ۱۷۹۹ء میں جام شہادت نوش کیا۔ مگر شومئی قسمت سے انگریز کے خلاف جن تحریکوں کا ذکر ہوتا ہے ان میں تحریک بالاکوٹ کو سرفہرست رکھا جاتا ہے، حالانکہ اس تحریک کے بانیوں نے مسلمانوں اور سکھوں سے نبرد آزما ہو کر انگریزی حکومت کی جڑوں کو مضبوط و مستحکم کیا مگر ایک سو سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے کہ اس تحریک کو ''اسلامی تاریخ'' بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

مولانا شاہ گردیزی کی زیر نظر کتاب ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' میری دانست کے مطابق اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جس میں تحریک بالاکوٹ کے صحیح خدوخال کو واضح کیا گیا ہے۔ مولانا گردیزی نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کے بعد اس کتاب کو مرتب کیا ہے یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ میں انقلاب آفریں کردار ادا کرے گی۔

ایک طبقہ فکر کے نظریات اس کتاب سے ضرور متاثر ہوں گے۔ شاید ان کی دل شکنی بھی ہو۔ مگر حقائق ہمیشہ تلخ ہوا کرتے ہیں۔ مولانا شاہ حسین گردیزی نے ان تلخ حقائق کو قند بنا کر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور مولانا اپنے اس مشن میں کافی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

فہرست

حرف حقیقت

سندھ مسلم لا کالج کراچی سے قرب مکانی کی بدولت طلبہ سے شب و روز ملاقاتیں ہوتیں۔ اسلامی علوم اور تحریکات پر گفتگو ہوتی۔ ان کے نشیب و فراز اور کامیابی و ناکامی کے اسباب و علل پر بحثیں ہوتیں۔ اس ضمن میں "سید احمد شہید" کی تحریک جہاد کا ذکر بھی آتا۔ چونکہ تحریک جہاد پر میری معلومات کچھ زیادہ نہ تھیں۔ صرف کورس تک محدود تھیں۔ اسلئے بازار سے حاصل مواد جمع کیا۔ جن میں مولانا سید محمد علی بریلوی، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مرزا حیرت دہلوی، مولانا ابوالحسن ندوی اور جناب غلام رسول مہر کی کتب تھیں۔ پھر انجمن ترقی اردو کراچی، لیاقت لائبریری کراچی رضا لائبریری کراچی کی کتب سے بھی استفادہ کیا۔ دوران مطالعہ مذکورہ کتب کے مندرجات آپس میں ملاتا۔ اولین اور متاخرین کتب کی تحریرات میں تطبیق کرتا۔ اس طرح حقائق تک رسائی ہوتی گئی اور رائے میں تبدیلی آتی گئی۔ پہلے میں "سید احمد شہید" کو مجاہد اور ان کی تحریک کو تحریک جہاد سمجھتا تھا۔ اور اس کی مخالفت میں ایک لفظ سننے کیلئے تیار نہ تھا۔ مگر اب سابقہ خیالات کو حقائق نے رد کر دیا اور تمام خوش فہمیاں جاتی رہیں۔

اور پھر یہ سوچ کر الفاظ کو نقوش کا وجود دیا کہ اس تحریک بالاکوٹ کا قرآن و سنت سے تو کوئی تعلق نہیں۔ صرف ایک تاریخی واقعہ ہے اور میری اسلامی معلومات کے مطابق اگر کوئی تیرھویں صدی کے تاریخی واقعہ پر اپنا نقطہ نظر پیش کر دے تو اس کے اسلام و ایمان میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ ہی آنا چاہیئے۔

ہمیں تحریک بالاکوٹ کے موضوع پر بڑی سنجیدگی اور مآل اندیشی سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ہم اس سوال سے اس تحریک کو تحریک

جہاد سمجھا جاتا رہا اور اس کی تبلیغ و تشہیر کی جاتی رہی۔ اس موضوع پر کتنی ہی کتب تالیف ہو چکیں۔ کتنے ہی عزت مآب اشخاص اسے جہاد قرار دے چکے مگر حقیقت روپوش نہ ہوئی اور آخر حقائق نے انسان کو پابہ گل کر لیا۔ تاہم افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو کچھ ہم کورس کی کتب میں پڑھتے ہیں ''سید احمد بریلوی'' ویسے نہیں۔ ہمارے ارباب قلم صرف اور صرف ''سید احمد بریلوی'' سے فکری اتحاد کی وجہ سے تحریک بالاکوٹ کو تحریک جہاد کا نام دیتے ہیں۔ اور ہندوستان کی اسلامیت اور تاریخ پر لکھے جانے والے ہر مضمون میں ''سید احمد بریلوی'' کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاد آزادی ۱۸۵۷ء تحریک خلافت اور تحریک پاکستان کی بنیاد بھی ''سید احمد بریلوی'' کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حالات و واقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ کاش کہ وہ یہ سوچتے کہ افق ہمیشہ غبار آلود نہیں رہ سکتا۔ کبھی تو مطلع صاف ہوگا اور چشم بینا حقیقت کو پا لے گی۔

جناب غلام رسول مہر مؤرخ ہونے کے ساتھ ''سید احمد بریلوی'' سے فرط عقیدت کے جذبات بھی رکھتے ہیں۔ اس عقیدت کو بحال رکھنے کیلئے فرضی قیاس اور دروغ نویسی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کی فطری کمزوریوں پر جہاد کا عمامہ سجا دیتے ہیں۔ جناب مہر نے ''سید احمد بریلوی'' کا تاریخی اور پھر شرعی مجسمہ تیار کر کے نئی پود کے سامنے رکھا اور اس کا تصور دل و دماغ میں بسانے کیلئے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے کورس میں شامل کرا دیا۔ جس کے نتیجہ میں ہر ''اسکول پڑھا'' ''سید احمد بریلوی'' کو ''مجاہد فی سبیل اللہ'' کا خطاب دینا ضروری سمجھتا ہے۔

اس مختصر کتاب میں جناب مہر کی اخفاء حق اور اظہار باطل کی تمام حرکات نہ پیش ہو سکتی ہیں اور نہ ان پر تبصرہ ہو سکتا ہے۔ تاہم میں نے ان کی ''حرکات کبیرہ'' کی نقاب کشائی ضرور کر دی ہے اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ایک مسلمان اپنے گروہی عقیدہ

کے تحفظ کی خاطر کس طرح اسلامی اقدار کو پامال کرتا ہے اور فکر انا میں خوف آخرت کو بھول جاتا ہے۔

اس کتاب میں ''قائد تحریک بالاکوٹ'' کا کردار مرکزی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حضرات کا تذکرہ ضمنی ہے اگر توفیق ایزدی شامل حال رہی تو ''شاہ اسمعیل دہلوی'' پر بھی اپنی معلومات تحریری صورت میں پیش کروں گا۔ جو ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' کی جلد دوم ہوگی۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر خواجہ رضی حیدر نبیرہ، حضرت مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی کا شکریہ ادا نہ کروں۔ جنہوں نے میری گذارش پر مسودہ دیکھا اور مناسب مشوروں سے نوازا۔ اس کے علاوہ مولانا سید سکندر شاہ گولڑوی، مولانا سید شاہ تراب الحق قادری، مولانا محمد رفیق زاہد چشتی، جناب گل محمد فیضی اور جناب حاجی احمد مجاہد کا تعاون بھی حاصل رہا جس کا میں صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

آخر میں حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ الازہری، حکیم نصیر الدین ندوی، پروفیسر منیب الرحمٰن، پروفیسر محمد افضل جوہر اور ادیب شہیر، جناب خواجہ رضی حیدر کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ جنہوں نے ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' پر گرانقدر تقریظات تحریر فرما کر میری تحقیق کی تائید و توثیق فرمائی۔

شاہ حسین گردیزی

۱۰ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ

﴿پیدائش و تعلیم﴾

سید احمد بریلوی یکم محرم الحرام ۱۲۰۱ھ کو رائے بریلی کے ایک سادات گھرانہ میں پیدا [۱] ہوئے۔ والد مکرم سید محمد عرفان نے ابتدائی نام "میر احمد" [۲] رکھا لیکن بعد میں سید احمد کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کا خاندان علم و عرفان کے ناطے گردونواح میں عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کے جد امجد کے دادا "شاہ علم اللہ" ایک مشہور باکمال بزرگ تھے۔

تعلیم: سید صاحب چار سال چار ماہ کے ہوئے تو شرفاء ہندوستان کی روایت اور دستور کے مطابق آپ کو مکتب بٹھایا گیا [۳] لیکن پڑھنے سے کوئی رغبت نہ ہوئی۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:۔

بزرگ سید بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ سے پرلے درجہ کا غبی مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ اسے تعلیم دینا بے سود ہے۔ کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں۔ میں ذہن کی بابت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ صرف اس قدر کافی سمجھتا ہوں کہ سید کی بچپن میں کیا پوری عنفوان جوانی میں بھی لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع [۴] نہ تھی۔

کریما: سید صاحب کی بے ذوقی اور بدشوقی بایں جار سید کہ کریما کا پہلا مصرع (کریما بہ بخشاء برحال ما) خاصہ دعائیہ ہے مگر یہ بھی بزرگ سید کو تین دن میں یاد ہوا تھا اس پر بھی کبھی "کریما" بھول گئے اور کبھی "برحال ما" کو دل سے محو کر دیا [۵]۔

تاہم والد اور اساتذہ اس کوشش میں رہے کہ سید صاحب زیور تعلیم سے آراستہ ہو جائیں۔

مرزا حیرت لکھتے ہیں۔

جب وہ (سید احمد) ایک ایک جملہ کو گھنٹوں جپے جاتا تھا۔ تب کہیں کسی قدر یاد آتا تھا اور دوسرے دن تماشا یہ تھا کہ وہ بھی چوپٹ۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو والدین اور میاں جی کی تنبیہہ پڑنے لگی اور گھر کی جھڑکی آنکھیں نکالنے سے گزر کر مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ اس سے بھی والدین کی آرزو پوری نہ ہوئی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ قدرتی طور پر اس کے دماغ میں قفل لگ گیا ہے اور یہ کسی طرح کی تنبیہہ سے بھی نہیں پڑھ سکتا تو ناچار ہو کر پڑھنے سے اٹھا لیا گیا۔[٦]

سید صاحب کی اس پیدائشی غباوت پر جب والدین اور اساتذہ عاجز و درماندہ ہو گئے تو سید صاحب کی کھلی چھٹی ہو گئی۔ وہ کھیلیں کودیں اور دن بھر آوارہ گردی کریں۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

"مطلق آزاد کر دیا اور اسے طبیعت پر چھوڑ دیا کہ چاہے جو کچھ کرے اسے اختیار ہے"۔[٧] ان تین برسوں کی کشمکش میں سید صاحب نے کیا حاصل کیا۔ آپ کے ہمشیرزادے سے سنیے۔

آپ نے تین سال کی طویل مدت میں قرآن حکیم کی چند سورتیں پڑھیں اور حروف ہجا لکھنے سیکھے۔[٨]

سید صاحب کے حصول علم کی اتنی سی داستان تھی۔ جسے اندیشۂ عجم نے رنگ آمیزی کر کے کیا سے کیا بنا دیا۔

سید صاحب طبعاً شریر نہ تھے اور نہ اتنے ذہین کہ انہیں شرارتوں کی سوجھتی بلکہ کسی کے استہزا کو بھی سمجھ نہ پاتے۔ لوگوں کے گھروں میں بلا روک ٹوک چلے جاتے جیسے کہ عموماً بڑی عمر کے ناسمجھ بچے کرتے ہیں۔ عورتیں بھی ان کی بھولے پن سے معترض نہ ہوتیں۔ آپ سے لکڑی وغیرہ چیزیں منگوا لیتیں۔ آپ کے بھائی اور خاندان کے افراد ان حرکتوں کو احمقانہ تصور کرتے ہوئے روکتے رہتے۔ والدین آپ کے کچھ زیادہ ہی سیدھے پن سے نالاں رہتے۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

بزرگ سید کے والدین، چچا وغیرہ (......کو) کچھ اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ یہ بڑا ہو کر ہمارا کفیل بنے گا۔ بلکہ انہیں یہ خیال تھا کہ جو نام ہم نے پیدا کیا ہے اور ہمارے بزرگوں نے علمی عزت حاصل کی ہے، اس کی بدلیاقتی کہیں اسے خیر آباد نہ کر دے۔[۹]

ع مزاج تو از حال طفلی نگشت

کے مطابق اپنے عادات واطوار کے لحاظ سے ہنوز چار سال چار ماہ چار روز کے معلوم ہوتے تھے۔

اسی دوران آپ کے والد ماجد جناب سید محمد عرفان دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

جناب غلام رسول مہر نے عقیدت و نیاز مندی کی وجہ سے سید صاحب کو کافیہ اور مشکوٰۃ کا قاری بنانے میں اپنا خون پانی کر دیا لیکن مجبوراً اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کوششوں کے باوجود سید صاحب کی طبیعت تحصیل علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے۔ لیکن اس مدت میں قرآن حکیم کی چند سورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ کے بڑے بھائی سید ابراہیم اور

سید اسحٰق بار بار لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے رہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اس تاکید کو بالکل بے سود سمجھ چکے تھے۔[۱۰]

تاہم سید صاحب کی تعلیم کے بارے میں جناب مہر صاحب کی جو تحقیق تھی وہ خود ہی اس کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یقین ہے کہ تعلیم کے اہتمام میں کوئی دقیقہ سعی فروگذاشت نہ ہوا ہوگا۔[۱۱]

جناب مہر صاحب کی تحقیق۔ ''ہوا ہوگا'' سے بالکل واضح ہوگئی ہے۔ لیکن عقیدت ''چیزے دیگر است''۔

---

۱ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۸۷

۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۸۳

۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۸۷

۴ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۸۹

۵ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۹۰

۶ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۹۱

۷ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۹۱

۸ سید محمد علی۔ مخزن احمد ص ۱۲

۹ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۳۹۰

۱۰ غلام رسول مہر: سید احمد شہید: ص ۶۱

۱۱ غلام رسول مہر: سید احمد شہید ص ۶۱

﴿ تلاش معاش ﴾

شفقت پدری سے محروم ہونے کے تقریباً دو سال بعد آپ نے تلاش معاش میں لکھنو کا سفر اختیار کیا۔ انیس برس کی عمر میں پہلی مرتبہ رائے بریلی سے لکھنو گئے جو سنی وشیعہ اختلاف کا مرکز تھا۔

جناب مرزا حیرت لکھتے ہیں:۔

ابھی تک سید صاحب کو شیعہ اور سنی کے تمام وکمال جھگڑے کا بھی علم نہ تھا وہ جانتے ہی نہ تھے کہ شیعوں کے اصول مذہبی کیا ہوتے ہیں اور سنیوں کے ارکان مذہبی کیا ہیں۔

دو چار باتیں یاد تھیں جو معمولی لکھے پڑھوں کو یاد ہوتی ہیں اور بے چارے زیادہ مذہبی پیچیدگیوں سے ناواقف [۱] تھے۔

سید صاحب کی بے علمی اور کم فہمی پر مرزا حیرت کا یہ جملہ پڑھیے اور سوچیے۔

جب سید صاحب (ملازمت کیلئے) ایک امیر کے ہاں گئے تو اس امیر نے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ آپ ''خارجی'' ہیں یا ''شیعان علی'' میں سے ہیں یہ دونوں لفظ آپ کے کانوں میں بالکل نئے تھے۔ خارجی کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا گو ''شیعہ'' کے لفظ سے پوری شناسائی تھی مگر ''شیعان علی'' کا جملہ ابھی تک کان میں نہ پڑا تھا۔ آپ بڑے پریشان ہوئے کہ جو کچھ اس نے سوال کیا ہے خبر نہیں اس کے کیا معنی ہیں۔ [۲]

سید صاحب کا یہ سفر علمی نہ تھا اور نہ ہی آپ کو علم سے کوئی علاقہ تھا۔ خالص معاشی سفر تھا۔ سید صاحب کے ہمراہیوں کو محنت ومشقت کرنا پڑتی تب شب کو نانِ جویں میسر ہوتی۔ اور سید صاحب کے بارے میں آپ کے بھانجے سید محمد علی (جو عمر میں آپ سے بڑے تھے) لکھتے ہیں۔

برائے حضرت (سید صاحب) طعام روزمرہ مقرر کردہ بود بہ جماعت یاراں ہر دو وقت آں وظیفہ مقرر خودمی آوردند [۳] یعنی لکھنو کے ایک شریف آدمی نے حضرت سید صاحب کیلئے دو وقت کا کھانا اپنے ہاں مقرر کردیا۔ سید صاحب دوستوں کے ساتھ جا کر اپنے دو وقت کا مقرر کھانا اس آدمی کے گھر سے خود لے کر آتے۔

ا مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ۳۹۵ ۲ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ:۳۹۶

۳ سید محمد علی۔ مخزن احمد ص ۱۴

بیعت وخلافت

لکھنو میں قیام طویل کے باوجود آپ کو مناسب ملازمت نہ مل سکی تو دہلی کا رخ کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۰ برس تھی۔ غربت وافلاس کے سبب بڑی مصیبت سے دہلی پہنچے۔ دہلی اس حال میں داخل ہوئے کہ چہرہ غبار آلود بال خاک آلود، کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے اور پیر جوتے کو ترس رہے [ا] تھے مزید یہ کہ دہلی میں کوئی جاننے والا بھی نہ تھا۔ مجبور ہو کر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مدرسے کا سہارا لیا اور ان سے ملاقات کی۔ اس دور میں ایک سید صاحب ہی بے چارے غربت کا شکار نہ تھے۔ بلکہ اکثر مسلمان اس غربت کے ہاتھوں ''نیم جاں'' مستفیدین تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز ہندوستان کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر چکی تھی۔ اس لئے مستفیدین ہر وقت ہالہ بنے رہتے۔ سید صاحب کے نزدیک شاہ صاحب کی یہ کیفیت دیکھی تو انہیں بھی تحصیل علم کا شوق دامن گیر ہوا۔

مرزا حیرت لکھتے ہیں۔

سید احمد کا عین منشاء یہی تھا کہ کسی طرح میں لکھ پڑھ کر فاضل اجل بن

جاؤں۔مگر طبیعت کے رجحان کو کیا کرتے کہ اس طرف رجوع ہی نہیں ہوتی تھی۔[۲]

اگر فاضل اجل ہو بھی جاتے تو ضروری نہیں کہ شاہ عبدالعزیز ہوتے کیونکہ

ایں سعادت بزور باز ونیست ؎ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

غالباً سید صاحب نے اپنی سادہ لوحی اور مسکین مزاجی کے باعث شاہ صاحب تک رسائی حاصل کی۔اور شاہ صاحب سے کوئی کتاب شروع کردی۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

مہینے تک پڑھایا گیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔سید احمد کی طبیعت بھی زچ ہوگئی اور شاہ عبدالعزیز بھی بوکھلا گئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ جب سید احمد صاحب کتاب لے کر بیٹھتے تو ترمرلے سے آنکھوں میں پھرنے لگتے تھے جیسا کہ اکثر ضعیف دماغ والوں کو یہ مرض عارض ہوتا ہے۔[۳]

پھر لکھتے ہیں:۔

ہزار طرح کوشش کی کہ سید احمد کو کچھ آجائے مگر دل ہی نہ لگا۔[۴]

جب سید صاحب کی غباوت اور عدم دلچسپی کی وجہ سے بالکل ناامیدی ہوگئی تو سید صاحب کو عام درس میں جو ہفتہ میں دو مرتبہ ہوتا تھا شمولیت کا حکم دیا گیا۔مرزا لکھتے ہیں۔

پھر آپ نے اجازت دے دی کہ قرآن خوانی اور حدیث کے پڑھنے کے وقت آپ موجود ہوا کریں۔[۵]

یعنی شاہ صاحب نے ''مردِ بے مراد'' سمجھ کر دست برداری کرلی۔اور اپنے قیمتی لمحات کو ضائع ہونے سے بچالیا۔حصول تعلیم کا یہ دوسرا موقع سید صاحب نے اپنی غباوت کے باعث کھودیا اور ہمیشہ کیلئے بے علم ہوکر رہ گئے۔آگے چل کر سید صاحب

کچھ بھی ہوئے لیکن بے علمی اور جہالت کا داغ دامن سے نہ دھو سکے۔

سید صاحب کے دیگر سوانح نگاروں نے مرزا حیرت دہلوی سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سید صاحب شاہ عبدالقادر دہلوی کی خدمت گزاری میں رہے شاہ عبدالعزیز تک نہ پہنچ پائے تھے۔ گویا شاہ صاحب سے استفادہ کی داستان، ہی من گھڑت ہے۔

سید صاحب تلاش معاش میں دہلی آئے تھے اور تحصیل علم میں لگ گئے۔ نتیجۃً نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ نیم دروں اور نیم بروں کی سی کیفیت بھی پیدا نہ ہو سکی، تاہم ایک کام آپ سے ایسا ہو گیا جو آگے چل کر عزت و شہرت کا باعث بن گیا۔ اور وہ حضرت شاہ عبدالعزیز سے بیعت طریقت کا شرف تھا۔ شاہ صاحب کا اسم گرامی ہندوستان کے مدارس اور خانقاہوں میں محتاج تعارف نہ تھا اس لئے سید صاحب اور آپ کے رفقاء کار نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

پیر پر بت پرستی کا الزام:

سید صاحب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے تصوف کی منزلیں طے کرتے رہے جب شاہ صاحب نے ''تصور شیخ'' کا فرمایا تو سید صاحب نے کہا یہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ تصور شیخ اور بت پرستی میں جو کہ بدترین کفر و شرک ہے کوئی فرق نہیں۔ شاہ صاحب نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلھا

سید صاحب نے کہا آپ جیسے حکم دیں ویسے کروں گا۔ لیکن شیخ کی عدم موجودگی میں تصور شیخ کرنا، اس سے امداد اور توجہ مانگنا بعینہٖ بت پرستی اور شرک صریح

ہے میں ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔[٦]

ترسم که نه رسی بکعبه اے اعرابی
کیں راه که تومی روی بتر کستان است

واضح رہے کہ یہ وہ سید صاحب بول رہے ہیں جو قرآن حکیم کی چند سورتوں کے علاوہ ناظرہ قرآن بھی نہیں پڑھ سکتے جنہوں نے کریما کا پہلا مصرع، کریما بہ بخشا برحال ما، تین روز میں یاد کیا اور پھر بھی اسے بھول جاتے۔ جنہیں تعلیم دینے سے شاہ عبدالعزیز عاجز آچکے تھے۔ جنہیں ''شیعان علی'' کا معنی بھی نہ آتا تھا۔

آج وہ سید صاحب فرمارہے ہیں کہ تصور شیخ بت پرستی اور شرک صریح ہے اور طرہ یہ کہ بت پرستی کا الزام پیر کو دے رہے ہیں۔

چو کفر از کعبه بر خیز و کجا ماند مسلمانی

اور اس پیر طریقت کو بت پرستی کا الزام دے رہے ہیں جن کی بزم علم وعرفان کے چرچے ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کئے ہوئے تھے اور اس تصور شیخ کو بت پرستی اور شرک صریح قرار دے رہے ہیں جو صدیوں سے روئے زمین کے اہل اللہ کا معمول رہا ہے۔

آپ چاہیں تو کریما کی تعلیم سے بھی کورے سید صاحب کے قول کو قبول کرلیں اور شاہ عبدالعزیز سے لے کر شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور مجدد الف ثانی سمیت شیخ بہاؤ الدین نقشبند پر بت پرستی اور کفر صریح کے ارتکاب کا فتویٰ عائد کردیں۔ اور اگر چاہیں تو اسے سید صاحب کی بے علمی اور خبط قرار دے لیں۔ اور یہ آخری فیصلہ زیادہ آسان ہے۔

تصور شیخ اور سرپرست دیوبند

تصور شیخ کی بارے میں سید صاحب کے نقطہ نظر کے بعد اب دیوبند کے

سرپرست مولانا رشید احمد گنگوہی کا بھی قول پڑھ لیں جو سید صاحب کے اخلاف سلسلہ کے ایک بزرگ ہیں تاکہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آجائیں۔

ایک دفعہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جوش میں تھے اور تصور شیخ کا مسئلہ درپیش تھا۔ فرمایا کہ کہہ دوں عرض کیا گیا کہ فرمایئے۔ پھر فرمایا کہہ دوں۔ عرض کیا گیا فرمایئے۔ پھر فرمایا کہہ دوں عرض کیا گیا فرمایئے تو فرمایا۔

تین سال کامل حضرت امداد کا چہرہ میرے قلب میں رہا ہے اور میں نے ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کیا۔

پھر اور جوش آیا۔ فرمایا کہہ دوں۔ عرض کیا گیا حضرت ضرور فرمایئے۔ فرمایا کہ اتنے سال حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے قلب میں رہے اور میں نے کوئی بات بغیر آپ کے پوچھے نہیں کی۔ [۷]

مولانا رشید احمد گنگوہی تصور شیخ کرتے رہے بلکہ تصور رسول ﷺ سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ تین سال ان کے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ اور کئی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے قلب میں رہے۔

سید صاحب کی تحقیق کی رو سے مولانا گنگوہی بت پرست اور کافر صریح ہوئے۔

نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان

کی مشہور ضرب المثل آپ کو نہیں سنانا چاہتا صرف: تنا عرض کرتا ہوں کہ

چوں شمع از پے علم باید گداخت که بے علم نتواں خدارا شناخت

میں محاکمہ کی لیاقت تو نہیں رکھتا۔ لیکن کریما کی تعلیم سے بھی کورے سید صاحب اور خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے مقام و مرتبہ میں تفریق کی

تمیز و تفہیم ضرور رکھتا ہوں۔

اگر سید صاحب کا پیر طریقت سے یہ مکالمہ صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے کہ راوی شاہ اسمٰعیل ہیں) تو سید صاحب کی خلافت کا قصہ ایک افسانہ تو ہو سکتا ہے حقیقت نہیں ہو سکتی۔ بت تراش اور بت شکن کا کوئی جوڑ نہیں۔ آتش اور آب کا کوئی میل نہیں۔ پیر اور مرید کی راہیں الگ الگ ہیں۔ پیر ''برافلاک رفت'' اور مرید ''بصحرا رود'' سید صاحب چونکہ تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ اسلئے تبلیغ کرنے اور دوسرے کو متاثر کرنے کا کوئی خاص گر نہ رکھتے تھے۔ جناب شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

وعظ و تبلیغ میں سید صاحب کو وہ ملکہ حاصل نہ تھا جو شاہ اسمٰعیل شہید کو تھا۔[۸]

ایک شخص بالکل بے علم ہو اور تبلیغ میں کوئی خاص ملکہ نہ رکھتا ہو تو وہ احیاء اسلام کیا کرے گا۔

---

۱ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۰۵

۲ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۰۶

۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۰۸

۴ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۰۹

۵ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۰۹

۶ سید محمد علی۔ مخزن احمد ص ۱۹

۷ اشرف علی تھانوی۔ مولانا۔ ارواح ثلثہ ص ۲۹۰

۸ محمد اکرم شیخ۔ موج کوثر ص ۱۷

﴿اسلاف سے برتری کا ادعا﴾

سید صاحب کو یہ زعم بھی تھا کہ وہ تمام موجودہ اور گذشتہ اولیاء کرام سے زیادہ کامل اور صاحب فضیلت ہیں۔ اور اکثر اس کا اظہار بھی کرتے رہتے کبھی کہتے ''مشائخ دہلی'' سے افضل ہوں اور کبھی اپنی زبان گوہر بار سے اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے برتری کا ذکر کرتے اور مثالیں دیتے۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں سید صاحب نے فرمایا۔

میں ایک دن مولانا شاہ عبدالعزیز کے دولت خانے پر حاضر ہوا اس وقت آپ کے پاس مولوی رشید الدین خاں بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ میں بہت دیر تک بہ انتظار تخلیہ دالان میں ٹہلتا رہا کہ جب یہ (مولوی رشید الدین خان) صاحب تشریف لے جائیں تو میں مولانا سے کچھ عرض کروں۔ اسی ٹہلنے کی حالت میں مجھ کو یہ الہام ہوا کہ اگر تو بندوں کی طرف التجا کرے گا تو ہم تیری دستگیری نہ کریں گے۔

اس پر مولانا مرتضٰی خان کا اجتہاد ملاحظہ ہو۔

اس الہام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں سید صاحب کا درجہ مولانا شاہ عبدالعزیز سے بڑھا ہوا تھا۔[۱]

سید صاحب کے الہام سے تو واقع یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سید صاحب کا مرتبہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بڑھ گیا تھا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کے طرز عمل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک مولانا رشید الدین خان دہلوی کا مرتبہ سید صاحب سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ شاہ صاحب نے مولانا رشید الدین خاں کو اپنے پاس بٹھایا ہوا تھا اور سید صاحب کو انتظار میں ٹہلنے دیا۔ اور سید صاحب جب دالان

میں ٹہل ٹہل کر تھک گئے تو آپ کو الہام ہو گیا۔

سید صاحب کو اپنی تعریف وتوصیف میں الہام ہوتے رہتے تھے۔ اگر شاہ صاحب کو بھی سید صاحب کے ان الہامات کا الہام ہو جاتا تو شاید وہ سید صاحب کی عزت افزائی کرتے۔ لیکن شاہ صاحب ایک عالم دین کی موجودگی میں ان کا پاس بیٹھنا بھی مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔

حضرت خواجہ قطب الدین سے بڑائی کا دعویٰ:

سید صاحب کے بھانجے جناب سید محمد علی رقم طراز ہیں کہ:۔

ایک روز عالم مراقبہ میں آپ کی ملاقات روح پرفتوح بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی۔ اس وقت سید صاحب نے دیکھا کہ ایک چتر نور مقدس کا خواجہ صاحب ممدوح کے سر پر سایہ کر رہا ہے۔ پس اس وقت آپ کو یہ بھی دکھائی دیا گیا کہ آپ کے سر پر دو چتر نورِ مقدس کے سایہ کر رہے ہیں۔[۲]

خواجہ بختیار کا کی جن سے مشائخ کا ایک عالم فیضیاب ہے۔ اس جلیل القدر ہستی کو کس طرح کم دکھا کر اپنی تعریف وتوصیف خود کر دی۔ اف اللہ! مراقبہ جیسی پاکیزہ چیز کو بھی خودنمائی کا آلہ بنالیا گیا۔

مشائخ دہلی سے افضلیت:

سید صاحب کو بزرگی اور بڑائی کی ڈینگیں مارنے کا بہت شوق تھا اسلئے فرماتے ہیں:۔

جب میں عالم مراقبہ ومعاملہ میں مشائخ دہلی کی ارواح کی طرف متوجہ ہوا تو خود کو تمام مشائخ سے اکمل وافضل پایا ہے۔[۳]

یہ مجذوب کی بڑ سید صاحب کے خبط کی دلیل ہے۔ بائیس خواجہ کی چوکھٹ دہلی میں خواجہ قطب الدین، خواجہ نظام الدین، خواجہ باقی باللہ، شاہ غلام علی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے علاوہ بے شمار جلیل القدر اور عظیم الفیض بزرگان اسلام ابدی نیند سو رہے ہیں۔ سید صاحب جن کی خاک پا کی ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے لیکن جس شخص کو اپنے مرشد طریقت سے بڑائی کا دعویٰ ہو تو وہ دوسرے اہل معرفت کا احترام کیونکر کر سکتا ہے۔

ارواح مشائخ میں اختلاف:

ایک روز ارواح مقدس حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ بہاؤالدین نقشبند سید صاحب کے حال پر متوجہ ہوئیں۔ اور ایک ماہ تک دونوں روحوں میں تنازعہ رہا۔ دونوں ارواح میں سے ہر ایک روح سید صاحب کو اپنی طرف کھینچنا چاہتی تھی۔ آخر دونوں روحوں نے آپس میں صلح کر لی۔ پھر دونوں نے مل کر آپ پر ایک پہر تک توجہ ڈالی۔ جس سے دونوں خاندانوں کی نسبت آپ کو حاصل ہوگئی۔ [۴] اس روایت سے جو کہ عالم بیداری میں واقع ہوئی ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب مقبولانِ خدا کی موت کے بعد ان کی ارواح سے امداد واعانت کے قائل تھے۔ اب سید صاحب کے متوسلین کو اس پر خوب غور کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ کیا ارواح سے امداد حاصل کرنے کے بعد سید صاحب کے اسلامی عقیدہ میں کوئی فرق آیا یا نہیں۔

پہلی صورت میں سید صاحب پر بدعقیدگی کا فتویٰ جاری کرنا پڑے گا اور دوسری صورت میں اپنے عقیدے کی اصلاح کرنا ہوگی۔

دونوں میں سے کوئی بھی ہو۔ ہم پیر اور مرید کے معاملہ میں دخل اندازی نہیں

کریں گے لیکن تعجب ضرور ہوتا ہے کہ آخران ارواح نے سید صاحب ہی کو اپنی توجہ کیلئے کیوں منتخب کیا۔ حالانکہ سید صاحب کے پیر طریقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (جو ظاہری و باطنی لحاظ سے مکمل نہیں اکمل تھے۔ اوران کی فیض رسانی کی شہرت چار دانگ عالم میں گونج رہی تھی) کوان ارواح مقدسہ نے نظر انداز کیا اور ایک ایسے بے چارہ کو چنا جو قرآن حکیم کی چند سورتوں کے علاوہ ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔

ایک خواب سے بڑائی کا دعویٰ:

سید صاحب نے ایک روز خواب میں ولایت مآب حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو دیکھا۔ حضرت علی ﷺ نے آپ کو اپنے دست مبارک سے غسل دیا اور اپنے ہاتھ سے سید صاحب کی خوب شست وشو کی جیسے کہ ماں باپ بچہ کو نہلاتے وقت شت وشو (صفائی) کرتے ہیں۔ اور حضرت فاطمہ نے آپ کو عمدہ لباس پہنایا۔[۵]

اس خواب میں مندرجہ ذیل چیزیں ہر قاری محسوس کرتا ہے۔

ا۔ سید صاحب کے مریدین نے اس خواب کو سچا سمجھا اور سید صاحب کی بزرگی میں بطور دلیل پیش کیا۔

۲۔ سید صاحب نے اس حیا سوز اور اخلاق باختہ خواب کو مریدوں کے سامنے اپنی بڑائی اور بزرگی کے طور پر پیش کرتے ہوئے حیا محسوس نہ فرمائی۔

۳۔ برہنگی کی حالت میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا۔ حضرت علی نے آپ کو ایسے غسل دیا جیسے ماں باپ بچہ کو غسل دیتے ہیں اور سید صاحب کے بدن کی خوب صفائی کی۔

۴۔اس ۲۵ سالہ معصوم بچہ کو حضرت فاطمہ نے عمدہ لباس پہنایا۔سید صاحب غالباً سات ہی روز میں بے حیائی کی ساری منزلیں طے کر کے اس مقام تک پہنچ گئے تھے، بے حیاباش و ہر چہ خواہی کن۔

اصل بات یہ ہے کہ سید صاحب کو اپنی بزرگی اور برتری کا خبط تھا۔اس لئے مریدین سے اس کا ذکر کیا۔کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل دے رہے ہیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا عمدہ لباس پہنا رہی ہیں تو اس سے بزرگی میں اضافہ ہوگا۔ مریدین کی حسنِ عقیدت میں زیادتی ہوگی۔اس خیال میں حیا کو بھی بھول گئے۔

---

۱ محمد جعفر تھانیسری۔مولانا۔سوانح احمدی ص ۱۲۱ ۲ سید محمد علی۔مخزن احمدی۔ص ۲۵

۳ سید محمد علی۔مخزن احمدی ص ۲۵۰ ۴ محمد جعفر تھانیسری۔مولانا۔سوانح احمدی۔ص ۶۵

۵ سید محمد علی۔مخزن احمد۔ص ۲۴

﴿مریدین کی تعداد اور اس کی حقیقت﴾

سید صاحب کی سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایسا خلعت قبولیت حاصل تھا۔ جو دورِ آخر میں کسی کو نصیب نہ ہوا تھا۔ حکایات وروایات آدمی کو حیران وششدر کر دیتی ہیں۔ مثلاً سید صاحب مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کیلئے نکلے تو جس شہر یا گاؤں گئے وہاں کے ہزاروں باشندوں نے شرک وبدعت سے توبہ کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت طریقت کی بلکہ بعض دیہاتوں کے تمام باشندے آپ کے مرید اور بندگانِ بے دام ہو گئے۔

لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب سید صاحب کو دیکھتے ہیں کہ وہ سکھوں سے جنگ کیلئے سرحد روانہ ہوتے ہیں اور ہمراہیوں کی تعداد اعلان عام اور کوشش بسیار کے باوجود پانچ سو سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔

شاہ ولی اللہی خاندان مشرک وبدعتی تھا:

ایک بات مزید حیرت انگیز ہے کہ مسلمان شرک سے توبہ کرتے رہے شرک تو مشرک کرتا ہے اور وہی اس سے توبہ کر سکتا ہے۔ لیکن سید صاحب کے دست کرامت پر مسلمان شرک سے توبہ کرتے رہے اور وہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خاندان مولانا تھانیسری لکھتے ہیں:۔

آپ دہلی سے روانہ ہو کر سب سے پہلے قصبہ پھلت میں کہ جہاں خویش واقارب شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ کے رہتے تھے تشریف لے گئے اس خاندان کے سب لوگ چھوٹے بڑے، مرد وعورت، آزاد وغلام سب آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور ہر قسم کے ''شرک وبدعات'' سے توبہ کر کے موحد، متبع سنت بن گئے۔ [۱]

حضرت شاہ ولی اللہ کا خاندان کیاان کے انتقال کے بعد ''مشرک'' ہوگیا تھا۔ اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی جاسکتی۔ مگر سید صاحب کے ہاتھ پر انہوں نے شرک سے توبہ ضرور کی۔

اب آپ سید صاحب کے ہزاروں اور لاکھوں مریدین کی تعداد والی روایات کو پڑھیں اور کذب وفریب کا اندازہ خود لگاتے جائیں۔

ہندوستان: دہلی میں قیام کے دوران یہ کیفیت تھی۔

۱۔ اب تو دور دور سے صدہا علماء وفضلاء اور مؤمنین ومومنات آ آ کر بیعت سے مشرف ہونے لگے۔[۲]

۲۔ مظفر نگر ومہاری وسہارن پور وگڑھ مکتیسر ورام پور وبریلی وشاہ جہاں پور وغیرہ دوآب کے تمام شہروں اور قصبات میں دورہ کر کے آپ خلائق کثیر کو راہ راست پر لائے اور بیعت سے مشرف فرمایا۔[۳]

۳۔ تقریباً تمام علمائے فرنگی محل سید صاحب کی بیعت سے مشرف ہوئے۔[۴]

۴۔ دس بارہ روز تک الہ آباد میں قیام رہا۔ وہاں ہزارہا خلقت آپ کی بیعت سے مشرف ہوئی۔[۵]

<u>بنارس میں ایک ماہ قیام رہا۔</u>

۵۔ اس عرصہ میں تقریباً پندرہ ہزار افراد آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔[۶]

۶۔ کانپور میں ہزارہا خلقت آپ کی بیعت سے مشرف[۷] ہوئی۔

۷۔ قصبہ (مچھاون) کے کل مسلمان مرد وعورت آپکی بیعت سے مشرف[۸] ہوئے۔

<u>دلموٴ میں قیام کے دوران</u>

۸۔ اس رات کو ہزارہا مرد وعورت بیعت سے مشرف[۹] ہوئے۔

ڈگڈگی میں قیام کے دوران

۹۔ شام کو بہت آدمی آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔[۱۰]

۱۰۔ یہاں الہ آباد میں ہزارہا خلقت آپ کی بیعت سے مشرف ہوئی۔[۱۱]

۱۱۔ یہاں (مرزا پور میں) ہزارہا خلقت آپ کی بیعت سے مشرف ہوئی۔[۱۲]

۱۲۔ (عظیم آباد میں) ہزارہا خلقت شرک وبدعات سے تائب ہو کر آپ کی بیعت میں داخل ہوئی۔[۱۳]

۱۳۔(شی پور میں) بہت سے اس شہر کے آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔[۱۴]

۱۴۔ (کلکتہ میں) یہاں حضرت کو بھی بیعت کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے ذرا بھی فرصت نہ ہوئی۔[۱۵]

۱۵۔ شہر کلکتہ میں بیعت کرنے والوں کی یہ کثرت تھی کہ ہزار پانچسو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے سات آٹھ پگڑیوں کو اس مجمع میں پھیلا کر ہر ایک بیعت کنندہ کو حکم دیتے تھے کہ ان پگڑیوں میں سے کسی ایک پگڑی کا کنارہ پکڑے۔ پھر آپ پگڑیوں کا ایک کنارہ تھام کر کلمات بیعت کو بآواز بلند تلقین کرتے اور یہ کیفیت دن بھر رہتی تھی۔[۱۶]

۱۶۔ کلکتہ اور اس کے نواح میں آپ کے مریدوں کی اس قدر کثرت ہو گئی کہ جو کوئی آپ سے بیعت نہ کرتا تھا۔ اس کو برادری سے خارج کر دیتے تھے اس وجہ سے بائعین کی اور بھی کثرت ہوگئی۔[۱۷]

عرب: یہ کیفیت ہندوستان کی تھی۔ کہ لوگ اس کثرت سے شرک وبدعت سے توبہ کر کے سید صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اب ذرا عرب کی حالت بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۷۔ ملک عرب کے بھی بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے فیض یاب ہوئے۔[۱۸]

۱۸۔ (مکہ مکرمہ میں) ہزارہا عالم وعامی جو اطراف وجوانب سے حج کو آئے ہوئے تھے آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

۱۹۔ (حج سے واپسی کی بعد بمبئی میں) یہاں بھی ہزارہا مخلوق آپ کی بیعت سے فیضیاب ہوئی۔[۱۹]

سرحد: (۲۰) آپ نے ملک بنیر اور سوات کا خوب دورہ کیا۔ تقریباً یہ دونوں علاقے آپ کے حلقہ بیعت میں داخل ہوگئے۔[۲۰]

۲۱۔ (ہشت نگر میں) لوگ اس کثرت سے بیعت کیلئے جمع ہوگئے کہ ایک ایک سے بیعت لینا مشکل ہوگیا۔[۲۱]

۲۲۔ (برمی کوٹ، تھانہ، چکدرہ) ان تمام مقامات پر عوام وخواص میں سے کثیر تعداد نے بیعت کی۔[۲۲]

۲۳۔ ملک کاغان جو کشمیر سے ملحق ہے۔ بہت لوگ داخل بیعت ہوئے۔[۲۳]

جنوں کی بیعت: سوانح نگار سید صاحب کی تعریف وتوصیف میں ایسے غلو کا شکار ہوئے کہ لاکھوں انسانوں کو داخل بیعت کر کے بھی راضی نہ ہوئے اور لاکھوں جنوں کو سید صاحب کا مرید کرادیا چنانچہ لکھتے ہیں۔

لاکھوں جن آپ کی بیعت سے فیضیاب ہوئے۔[۲۴]

معلوم نہیں "لاکھوں فرشتوں" نے سید صاحب سے بیعت طریقت کی سعادت حاصل کیوں نہ کی۔ یا سید صاحب کے سوانح نگاروں نے دیدہ ودانستہ انہیں محروم کردیا۔ جب جن بیعت سے فیضیاب ہورہے تھے نہ جانے کن افراد نے انہیں دیکھا۔ غالباً شروع میں شمار کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن جنوں کی کثرت سے عاجز ہونے کے بعد لاکھوں کا لفظ استعمال کیا ہوگا۔ لاکھوں جنوں کی بیعت سے لاکھوں انسانوں کی بیعت کا معمہ کچھ کم نہیں ہے۔

۱؎ محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمدی۔ص ۸۵
۲؎ محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمد۔ص ۸۰
۳؎ محمد جعفر تھانیسری۔مولانا۔سوانح احمد۔ص ۸۵
۴؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۰۶
۵؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۲۲
۶؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۲۳
۷؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۲۶
۸؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۲۶
۹؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۰
۱۰؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۱
۱۱؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۲
۱۲؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۲
۱۳؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۵
۱۴؎ سوانح احمدی۔محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۵
۱۵؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۳۶
۱۶؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۴۳
۱۷؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۴۳
۱۸؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۵۱
۱۹؎ محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمدی۔ص ۱۶۰
۲۰؎ محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمدی۔ص ۱۶۰
۲۱؎ غلام رسول مہر۔سید احمد شہید۔ص ۳۲۷
۲۲؎ غلام رسول مہر۔سید احمد شہید۔ص ۳۹۴
۲۳؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ص ۲۵۲
۲۴؎ سوانح احمدی محمد جعفر تھانیسری۔مولانا ص ۱۶۰

دعوتوں کا منظر

سید صاحب کے معتقدین بلا وجہ دوسروں کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ مریدین ومعتقدین کے ہاں دعوتیں کھاتے ہیں اور نذرانے وصول کرتے ہیں۔ اگر سید صاحب کے شب وروز پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب دعوتیں اڑانے اور نذرانے وصول کرنے میں تمام پر سبقت لے گئے۔ پہلے دعوتوں کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے اور پھر نذرانوں کا تماشا دیکھئے۔

پر تکلف دعوتیں: (بڈھانہ میں) زیادہ تر مولانا عبدالحی کے ہاں کھانا پکتا رہا۔ وہ ہر روز غایت درجہ تکلف کرتے۔ سید صاحب تکلف سے روکتے تو کہتے حضرت آپ کی معمولی سی آسائش کیلئے میرا گھر بھی بک جائے تو اسے سعادت سمجھوں گا۔ [۱]

مولانا عبدالحی عالم ہونے کے باوجود پُر تکلف دعوتیں کر کے فضول خرچی کے مرتکب ہوتے رہے۔ قرآن حکیم نے تو فضول خرچی کرنے والوں کو "اخوان الشیٰطین" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ چونکہ یہ پیر اور مرید کا معاملہ ہے اس لئے ہم دخل در "ماکولات" نہیں کرتے۔

پیرزادوں کا سا دورہ: سید صاحب جب ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے پر نکلے تو عام پیرزادوں کا سا طریقہ اختیار کیا ہم تو اس قابل نہیں کہ کچھ عرض کریں۔ جناب غلام رسول مہر اپنا تاثر لکھتے ہیں۔

"یہ دورہ بہ ظاہر پیروں اور پیرزادوں کا سا تھا۔ یعنی سید صاحب مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ پھرتے رہے۔ ہر مقام پر دعوتیں بھی ہوئیں"۔ [۲] دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"سید صاحب کا عام انداز اگرچہ وہی تھا۔ جس پر اس وقت کے پیرزادے

عمل پیرا تھے''۔[۳]

اگر آپ یوں کہہ لیں کہ دعوت طعام کیلئے دربدر پھرتے رہے تو بے جانہ ہوگا۔

عظیم الشان دعوت: مرشد آباد کے دیوان غلام مرتضیٰ نے قافلے کو روک لیا اور اصرار کیا کہ ''میرے وطن (کہنہ) چلیئے۔ جس بنگلے میں آپ کو ٹھہرانا منظور تھا۔ اس کی محض درستی اور آرائش پر پانچ ہزار روپے صرف کئے۔ اس کے باہر بڑا بازار لگوایا اور منادی کرادی کہ سید صاحب کے ہمراہی جو کچھ خریدیں۔ اس کی قیمت کا حساب رکھا جائے۔ میں خود پوری رقم ادا کروں گا''۔[۴]

اگر اس کو فضول خرچی کا نام نہیں دیا جاسکتا تو پھر وہ کون سی چیز ہوگی جسے فضول خرچی کے بدترین نام سے تعبیر کیا جائے گا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید صاحب کی درویشی اور شاہ اسمٰعیل کے تکفیر ساز قلم کی سیاہی خشک ہوگئی تھی۔ ورنہ ایسی فضول خرچی اور بدعت کو وہ ضرور ک، ف، ر سے تعبیر کرتے۔

وہ لوگ جو میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسہ وجلوس پر خرچ کو فضول خرچی کا نام دے کر مسلمانوں کو ''اخوان الشیٰطین'' کا لقب دیتے ہیں۔ وہ سید صاحب کے معتقد خاص دیوان غلام مرتضیٰ پر تین حرف کیوں نہیں بھیجتے۔

پلاؤ میں گھی کی کثرت: (بمبئی میں) روزانہ پرتکلف دعوتیں ہوتی تھیں۔ پلاؤ میں گھی بہت ڈالتے تھے۔ [۵] دوسروں پر طعنہ زنی کرنے والے سید صاحب کے مداح سید صاحب کی ''دعوت خوری'' کی یہ داستانیں پڑھ کر بھی نہ سوچیں تو سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

دعوتوں کی کثرت: کھانے کی دعوتیں مختلف افراد کی طرف سے پے در پے آنے لگیں۔ سید صاحب نے نمازیوں کو تیس تیس چالیس چالیس کی جماعتوں میں بانٹ دیا۔ اور داعیوں کی باریاں مقرر کر دیں تا کہ کسی کو دعوت قبول نہ کرنے کی شکایت نہ رہے۔ آپ تقریباً دو ہفتے چارسدہ میں ٹھہرے رہے۔ دونوں وقت نمازیوں کی مختلف ٹولیاں داعیوں کے ہاں کھانے کھائیں۔ [٦]

معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب معہ جماعت مجاہدین دعوت طعام کی بڑے دلدادہ تھے۔

مقبرہ میں دعوت: مغرب کی وقت چمکنی پہنچے۔ جہاں شیخ عمر نام کے ایک بزرگ کا مقبرہ تھا ان کی اولاد میں سے ایک بی بی مقبرے کی متولیہ تھی۔ اس نے پورے لشکر کیلئے کھانا پکوایا۔ کھچڑی بھی تھی گوشت بھی اور تنور کی روٹیاں بھی۔ [٧]

دعوت طعام اور وہ بھی ایک درگاہ کی متولیہ کی طرف سے درگاہ میں۔ لیکن کسی کو دعوت طعام پر اعتراض نہ ہوا۔

دعوت اور نذرانہ: سید عبدالقیوم نے بڑے اہتمام سے دعوت کی۔ اور دوسرے ہدایا کے علاوہ ایک بھینسا سید صاحب کی نذر کیا جو اتنی غیر معمولی ڈیل ڈول کا تھا اور اس درجہ موٹا تازہ تھا کہ ہاتھی کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ [٨]

دھونکل سنگھ کی دعوت: جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔ سہارنپور کے تحصیل دار دھونکل سنگھ نے بھی سید صاحب کی دعوت کی۔ [٩] اگر گراں نہ گزرے تو اتنا عرض کر دوں کہ سید صاحب کو دعوت اڑانے سے مطلب تھا عام ازیں کہ صاحب دعوت کافر ہو یا مسلمان۔

انگریز کے سپاہی: سپاہیوں نے دعوت طعام پر اصرار کیا تو فرمایا۔اس شرط پر منظور کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہوں پکایا جائے۔انہوں نے مان لیا۔[۱۰]

انگریز کی داشتہ: کانپور کے ایک انگریز کی مسلمان بی بی نے اپنے داماد مرزا عبدالقدوس کو رائے بریلی بھیج کر سید صاحب کو بلوایا[۱۱] تھا۔آپ گنگا کو عبور کر کے انگریز کی مسلمان بی بی کے مکان پر اترے۔[۱۲]

انگریزوں نے بہت سی مسلمان عورتوں کو بیویوں کی طرح رکھا ہوا تھا یہ کانپوری عورت انگریز کی ایک ایسی ہی بیوی تھی جس کے ہاں سید صاحب اترے۔

انگریز کی دعوت: سید صاحب کے بھانجے سید محمد علی لکھتے ہیں۔

جب عشاء کی نماز ہو چکی۔اس وقت دیدبانوں نے عرض کیا کہ کچھ مشعلیں ہماری طرف آرہی ہیں۔اسی گفتگو کے دوران کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار مختلف قسم کے کھانے لے کر کشتی کے قریب کھڑا ہے اور پوچھتا ہے۔ پادری صاحب کہاں ہے۔سید صاحب نے کشتی سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ تشریف لائیے۔انگریز فوراً گھوڑے سے اترا اور اپنی ٹوپی سر سے اتار کر کشتی میں سید صاحب کے پاس حاضر ہوا۔مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ میں نے اپنے نوکروں کو آپکے قافلہ کی آمد کی اطلاع کیلئے متعین کر رکھا تھا۔آج خبر ملی کہ آپ بمعہ قافلہ اس طرف آرہے ہیں۔ یہ خوشخبری سن کر میں نے ماحضر تیار کیا اور خدمت میں حاضر ہو گیا۔[۱۳]

زانی انگریز کی دعوت: ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔

سید صاحب نے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اس کی دعوت نہ مانئے لیکن میری دعوت قبول کرنے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کرلی۔[۱۴]

ایک فرنگی عورت کی دعوت: من جملہ بیعت کرنے والوں کے منڈود صاحب فرنگی کی عورت بھی تھی۔ جس نے بیعت کرنے کے بعد سات روز تک دونوں وقت آپ کی دعوت کی اور ایک مکان عظیم الشان معہ اسباب ضروری کے آپکی نذر کیا۔[۱۵]

انگریزی کمپنی کے وکیل کی دعوت:

سید صاحب کلکتہ میں منشی امین الدین احمد کے ہاں قیام پذیر ہوئے یہ صاحب کون تھے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

یہ منشی امین الدین احمد .... جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انہیں وکیل کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے۔ سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔[۱۶]

انگریزوں، ان کی بیویوں اور ملازمین کی اتنی کثرت سے دعوتیں سید صاحب کی انگریز دوستی کی غمازی کرتی ہیں۔ ورنہ ان کو پادری صاحب کی دعوت کی کوئی حاجت نہ تھی ۔ جب کہ انگریز سید صاحب سے خائف بھی نہ تھے اور سید صاحب وضاحت فرما چکے تھے کہ مجھے سرکار انگریزی سے کوئی مخاصمت نہیں اور دوسری طرف سید صاحب کی دعوت طعام سے لگن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مہاراجہ کی شاہانہ دعوت: گوالیار میں مہاراجہ کی طرف سے مہمانداری کا پورا انتظام تھا۔ کئی مرتبہ ہندوراؤ نے دعوتیں کیں ایک دعوت کی تفصیل راویوں نے یوں بیان کی ہے۔ کہ مرہٹی کھانا بھی پکوایا، شیرمال، پراٹھے، پلاؤ، متنجن، قلیہ، فیرنی، یاقوتی، کباب پسندے، مرغ بریاں وغیرہ بھی تیار کرائے۔ سید صاحب اور بعض بلند پایہ ساتھیوں کے ہاتھ ہندوراؤ نے خود دھلوائے۔ کھانے کے بعد جو پان پیش کئے وہ سب ورق طلاقیں ملفوف تھے۔ بہت سے تحائف خوانوں میں لگا کر نذر کیلئے لائے گئے۔ ان میں موتیوں کا ایک بیش بہا ہار اور دو چغے بھی تھے۔ جس پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔ [۱۷]

آخر ہندو مہاراجہ نے کس اسلام اور جہاد کی خوشی میں سید صاحب کی اتنی عظیم الشان دعوت کی۔ اس کا کچھ مقصد تھا اور وہ یہی ہوسکتا ہے کہ مہاراجہ کو انگریز کی خوشنودی درکار تھی۔ تو وہ اس صورت میں حاصل کررہا تھا اور سید صاحب نے بھی خوب مزے سے یہ دعوتیں اڑائیں۔ سید صاحب کے متوسلین پہلے اپنے پیر طریقت کی دعوتوں کا حال دیکھ لیں۔ پھر کسی دوسرے پر اعتراض کریں۔

---

۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۲۷
۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۱۲۸
۳ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۱۷۲
۴ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۲۲۹
۵ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۲۲۹
۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۲۷
۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۶۲
۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۹۵
۹ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۲۸
۱۰ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۲۶
۱۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۵۹
۱۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۰
۱۳ سید محمد علی۔ مخزن احمدی ص ۲۷
۱۴ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۹۰
۱۵ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا سوانح احمدی ص ۱۲۶
۱۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۰۵
۱۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۷۴

نذرانوں کی جھلک

سید صاحب معاشی لحاظ سے بڑے تنگدست تھے۔ حصول معاش کیلئے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا کامیابی نہ ہوئی۔ ایک شریف آدمی نے دو وقت کا کھانا اپنے گھر سے مقرر کر دیا۔ سید صاحب روزانہ جاتے اور اپنا کھانا لے آتے۔

جب بعض وہابیت پسند افراد نے اپنی مطلب برآری کیلئے آپ کی ولایت کا چرچا کیا تو نذرانے آنے لگے۔ جس سے سید صاحب اور آپ کے متوسلین شادکام ہوتے۔ نذرانوں، چندے اور صدقہ کے علاوہ کوئی مستقل اور معقول آمدنی نہ تھی۔ معاشی تنگی کے وقت اس انتظار میں رہتے کہ کہیں سے کوئی نذرانہ صدقہ اور مال خیرات آ جائے۔ جب ناامیدی ہوتی تو قرضہ لے کر گذارا کرتے جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

آپ اپنے ایک دوست ''شاہ میر'' سے دو سو روپے قرضہ لائے پھر نذر کے روپے آئے تو رقم واپس کر دی۔[۱]

لیکن جب آپ اپنے آبائی وطن گئے تو نذرانوں میں مزید کمی آ گئی اور وقت مشکل سے کٹنے لگا۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

وطن میں پہنچ کر نذر و نیاز روزانہ کی آمدنی بھی بند ہو گئی تھی۔[۲]

کیونکہ علاقائی لوگ اس وقت تک یا تو سید صاحب کی ولایت کے قائل نہ تھے یا ناواقف تھے اور ان کو پہلے کی طرح ایک بھولا بھالا آدمی سمجھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں سید صاحب لوگوں سے قرضہ لیتے۔ اسی امید پر کہ نذرانہ یا چندہ مل جائے گا تو ادا ہو جائے گا۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

متفرق سواریوں اور باربرداریوں کے بائیس (22) روپے واجب الادا تھے۔اس اثنا میں لوگوں سے نذریں ملتی رہیں۔آپ نے بائیس (22) روپے وہ ادا کیئے۔تین روپے بطور انعام دیئے۔[۳]

قالین: سید صاحب صرف رقم ہی نذرانے میں وصول نہ کرتے تھے بلکہ جو چیز مل جائے لینے سے انکار نہ فرماتے۔غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

شیخ (غلام علی) صاحب نے بیسوں ہدایا کے علاوہ ایک نہایت قیمتی قالین بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔[۴]

اوراس کے بعد رقمطراز ہیں:

قیمتی پارچے بطور نذر سید صاحب کی خدمت میں گذارے۔[۵]

غالباًاس دور میں سید صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص امداد کا زیادہ مستحق نہ تھا۔

بھینسا: کارو (سندھ) میں سید چورن شاہ ایک ممتاز بزرگ تھے۔سید صاحب کے حکم سے سید حمید الدین اور سید اولاد حسن نے ان سے ملاقات کی وہ سید صاحب سے ملاقات کیلئے آئے تھے اور بڑا بھینسا بطور نذرانہ پیش کیا۔[٦]

جو شخص پارچوں کی قبولیت سے انکار نہیں کرتا وہ بھینسے کو کیونکر چھوڑ سکتا ہے۔ اگر خوش عقیدہ مسلمان سید صاحب اوران کے رفقاء کی سُوءِ عقیدگی سے بے خبری میں نذرانے پیش کرتے تو اس بے تامل قبول کرلیا جاتا۔اور اگر کوئی مسلمان یہی بھینسا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، اور حضرت بہاؤالدین نقشبند رحمہ اللہ علیہم اجمعین کے مزار پر مجاورین کو دیتا تو وہ بھینسا غیر اللہ سے نسبت کی وجہ سے حرام ہو جاتا۔لیکن سید صاحب کے حضور پیش کرنے سے وہ حرام نہ

ہوا۔شاید سید صاحب غیر اللہ نہ تھے۔

فرزند کا نذرانہ : نذرانوں کی انتہا ہوگئی۔

اب بھینسے سے بھی بڑی چیز نذرانہ پیش کی جاتی ہے پڑھیے اور سر دھنیے۔

سب سے عمدہ تحفہ جو شیخ (فرزند علی) صاحب لے کر آئے وہ امجد نام کا ایک نوجوان تھا جس کو انہوں نے مثل ابراہیم خلیل اللہ، اللہ کی راہ میں نذر کر کے سید صاحب کے حوالے کر دیا۔[۷]

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ایک طرف بھینسا بلکہ بکرا سید صاحب کے علاوہ کسی دوسرے بزرگ کو نذرانہ پیش کیا جائے تو وہ غیر اللہ سے نسبت کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے۔اور اگر سید صاحب کو نذرانے میں اپنا بیٹا پیش کر دیا جائے تو وہ نہ صرف آدمی کی بزرگی و بڑائی کی دلیل بن جاتا ہے۔ بلکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا مثیل ہو جاتا ہے۔

گرما گرم حلوہ : افسوس ہے اس دعا بلعم باعوری پر جو حلوہ خوری کیلئے کی جائے لیکن حیرت ہے کہ سید احمد بریلوی بھی آمد حلوہ کی دعا مانگتے ہیں۔

ایک دفعہ ہمراہیوں نے سید صاحب سے گذارش کی کہ آپ دعا کریں کہیں سے کھانا آجائے۔مولانا تھانیسری لکھتے ہیں۔

سید صاحب دعا کرنے کے بعد ایک کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے اسی وقت ایک آدمی جس کے سر پر ایک طباق کلان گرما گرم حلوے سے بھرا ہوا رکھا تھا۔سید صاحب

کے سرہانے آ کر آپ کو جگانے لگا۔ آپ نے منہ کھول کر دیکھا تو ایک آدمی مع گرما گرم حلوے کے حاضر ہے۔[۸]

سید صاحب کیسے مستجاب الدعوات تھے۔فوراً حلوہ مع آدمی کے حاضر ہو گیا کاش کہ سید صاحب ایسی ہی دعا سرحدی مسلمانوں کے قتل عام سے پہلے کر لیتے اور مسلمانوں میں خونریزی نہ ہوتی۔

داروغہ کی نذر: سئی ندی کے پار سے دو آدمیوں کی آواز آئی کہ کشتی بھیجو۔ سید صاحب خود مسجد سے باہر نکلے اور پوچھا۔ آپ کون لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ سید صاحب کے ایک مرید سید یٰسین نے جو توپ خانے میں داروغہ تھا۔ کچھ روپیہ بطور نذر بھیجا ہے۔ کشتی بھیجی گئی۔ وہ دو آدمی آئے روپیہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔[۹]

ہری رام کی نذر: ہری رام کشمیری وہاں (غازی آباد میں) تحصیل دار تھا ....نیازمندانہ حاضر ہوا اور شیرینی کے علاوہ کچھ نذر بھی بطور نذر پیش کیا۔[۱۰]

بدھ رام کا نذرانہ: (پشاور) بدھ رام نام ایک مشہور (ہندو) سیٹھ تھا۔ وہ سید صاحب کی خدمت میں آیا تو نقد روپے کے علاوہ انگور، انار، پستہ، بادام، ناشپاتی اور بہی کی ٹوکریاں اور تھیلے لایا۔[۱۱]

شیخ غلام علی کے نذرانے:

جو لوگ علماء مشائخ کے نذرانوں پر معترض ہیں وہ سید صاحب کی ان "نذری فتوحات" پر کیوں مہر بلب ہیں۔ سید صاحب کے نذرانوں کی ایک طویل فہرست

ہے۔ہم تو ''مشتے نمونہ از خروارے'' پیش کر رہے ہیں۔ پڑھئے۔

جناب مہر لکھتے ہیں۔

شیخ (غلام علی الہ آبادی) صاحب نے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں وہ بہ حیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی۔[۱۲]

یہ بیس ہزار ۱۸۲۴ء کے ہیں، آج کے نہیں۔ اتنی کثیر رقم سید صاحب کو بطور نذرانہ پیش کی جاتی تھی۔ لیکن افسوس ایسے لوگوں پر ہے جو ایک چونی لینے والوں کو تو ہر وقت ملامت کا نشانہ بناتے ہیں اور بیس ہزار والوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

انگریزی ملازم کی نذر: بیعت کرنے والوں میں سے ممتاز اصحاب یہ تھے۔ داروغہ محمد رحم ....، محمد تقی قصاب جو انگریزی فوجوں میں گوشت کا بڑا ٹھیکیدار تھا۔ بعض شیرینی، پارچات اور نقد کے کئی کئی خوان نذر میں پیش کیے۔[۱۳]

دو دو سو کے نذرانے: مولوی کرامت علی، صدر امین، شیخ محمد تقی، بستی میاں، رنجیت خان ان سب نے دو دو سو روپے نذرانے گزارے۔ قلعہ کے میگزین کے خلاصیوں نے بھی دو ہی سو روپے دیئے۔[۱۴]

مرغوں اور انڈوں کی نذر: سید صاحب کے یہاں یہ طرز تھا کہ اس ملک کے جو لوگ آپ کی ملاقات کو آتے تھے وہ تحفے کے طور پر کوئی ''مرغ لاتے، کوئی سیر دو سیر شہد یا گھی لاتے، کوئی چاول، کوئی مرغی کے انڈے لاتے۔ آپ (سید صاحب) یہ تمام چیزیں بہ حفاظت تمام اپنے باورچی خانے میں رکھوا دیتے۔[۱۵]

یعنی سید صاحب ہر قسم کی نذر قبول کرتے تھے۔ ان میں رقم، قالین، کپڑے،

انگور، انار، پستہ، بادام، ناشپاتی، چاول، انڈہ، مرغا، حلوہ، شیرینی، شہد، بھینسا اور بیٹا وغیرہ چیزیں شامل ہوتیں۔ لیکن طعنہ سید صاحب کے مخالفین کو ملتا ہے۔

ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۲۳
۲۔ محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۹۳
۳۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۸۵
۴۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۵۷
۵۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۵۸
۶۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۸۴
۷۔ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمد ص ۱۶۸
۸۔ محمد جعفر تھانیسری سوانح احمدی ص ۶۹
۹۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۳۵
۱۰۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۲۶
۱۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۵۲
۱۲۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۹۱
۱۳۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۲۶
۱۴۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۹۲
۱۵۔ ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا سیرت سید احمد شہید اول ص ۵۴

مزارات پر حاضری

سید صاحب مقابر، مزارات اور مقامات مقدسہ کی زیارت اور ان سے فیوض وبرکات کے حصول کیلئے شدِ رحال کرتے۔ مقابر پر مراقبے بھی کرتے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل اللہ کی ''حیات بعد الممات'' کے منکر نہ تھے۔ ورنہ مراقبہ چہ معنی دارد۔

سید صاحب کی یہ ''قبر دوستی'' شاہ اسمٰعیل کے مسلک ومزاج کے خلاف تھی۔ وہ ان رسوم کے پابند نہ تھے۔ اس لئے سفر حج کے دوران مدینہ منورہ نہ گئے۔ بلکہ اس سے پہلے اپنے تایا حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خلاف بایں وجہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''حاضر وناظر'' ہونے کے قائل تھے فتویٰ تضلیل صادر فرما چکے تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے ان مسائل میں اپنے پیر طریقت کے خلاف کوئی فتویٰ تضلیل دیا یا نہیں۔ انہیں منع کیا یا نہیں۔ تاہم سید صاحب کی سوانح سے مندرجہ ذیل مزارات اور مقامات پر حاضری کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام: سید صاحب کو بہت دفعہ مرقد مبارک کی داخلی بھی اس طرح سے حاصل ہوئی کہ دو گھڑی تک سید صاحب مرقد مبارک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مراقب بیٹھے رہے۔[۱]

(۲) حضرت حوا علیہا السلام: (جدہ میں) اس مقام کی بھی زیارت کی جو حضرت حوا علیہا السلام کے نام سے مشہور تھا۔[۲]

(۳) ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا:

جنت المعلیٰ میں پہنچے اور ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار پر دیر تک مصروف دعا رہے۔[۳]

(۴) ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا:

وادی (فاطمہ) میں مرقد مبارک حضرت ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ آدھی رات کے قریب حضرت چند رفیقوں کے ساتھ زیارت کیلئے وہاں تشریف لے گئے۔[۴]

(۵) حضرت ابوعبیدہ اور شیخ یمنی رضی اللہ عنہما:

وادی صغریٰ میں حضرت شیخ عبدالرحیم یمنی اور حضرت ابوعبیدہ بن حارث جو غزوہ بدر میں زخمی ہو کر اس مقام پر شہید ہوئے تھے کی زیارت سے مشرف ہوئے۔[۵]

(٦) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ :

سید صاحب حضرت خواجہ خواجگان خواجہ بختیار کاکی قدس سرہ کے مرقد مبارک پر مراقبہ میں بیٹھے تھے۔[٦]

(۷) حضرت سید عیدروس رحمۃ اللہ علیہ : عدن میں پہنچنے کے بعد حضرت سید صاحب جناب سید عیدروس کے مرقد مبارک پر جو اس شہر میں واقع ہے زیارت کے واسطے تشریف لے گئے۔[۷]

(۸) حضرت اخوند درویزہ رحمۃ اللہ علیہ: سید صاحب نے (پشاور سے) روانہ ہوتے وقت اخوند درویزہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔[۸]

(۹) حضرت پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ: تورسک کے راستے باچا، جہاں آپ نے سید علی ترمذی وغوث بونیر (المعروف پیر بابا) کے مزار کی زیارت کی۔[۹]

(۱۰) حضرت سید عبدالوہاب ترمذی رحمۃ اللہ علیہ: باچا سے شل بانڈی گئے۔ جہاں سید عبدالوہاب (عرف عبدل بابا) کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔[۱۰]

(۱۱) حضرت حمزہ اور مقبولان خدا: سید صاحب نے آہستہ آہستہ حرم مبارک کے تمام مآثر کی زیارت کی۔ مثلاً جنت البقیع، سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ، جبل احد، مسجد قبلتین، مسجد قباء، بیر خاتم وغیرہ۔[۱۱]

(۱۲) مقام حدیبیہ: حدیبیہ میں ٹھہرے۔ جہاں بیعت رضوان ہوئی تھی۔ وہاں رفیقوں سمیت دیر تک مصروف دعا رہے۔[۱۲]

(۱۳) حضرت شاہ علم اللہ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ:

سید صاحب سید علم اللہ شاہ کے مزار پر جا کر دیر تک مشغول دعا رہے۔[۱۳]

---

۱ محمد جعفر تھانیسری مولانا سوانح احمد ص ۱۵۸
۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۲۱
۳ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۲۱
۴ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمدی ص ۱۵٦
۵ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمد ص ۱۵۷
٦ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمد ص ٦۵
۷ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمدی ص ۱۴۹
۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ٦۵۸
۹ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۰۰
۱۰ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۰۱
۱۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۲۷
۱۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۲۱
۱۳ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۳٦

نکاحِ بیوگاں

سید صاحب کی اسلامی خدمات میں نکاحِ بیوگاں کو یہ کہہ کر شمار کیا جاتا ہے کہ اس وقت مسلمان عورتوں میں نکاح ثانی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سید صاحب نے اس سنت کا احیاء کیا۔

لیکن سید صاحب کی زبان پر نکاح ثانی کے الفاظ اس وقت آئے جب ان کے بڑے بھائی سید محمد اسحٰق کا انتقال ہوا اور ان کی نوجوان بیوی سیدہ ولیّہ بیوہ ہو گئیں۔ سید صاحب نے انہیں نکاح کا پیغام دیا۔ چونکہ سید محمد اسحٰق ذی علم اور صاحب فراست آدمی تھے اس لئے سیدہ ولیّہ نے سید صاحب کا پیغام رد کر دیا۔

سید صاحب کے سوانح نگار سیدہ ولیّہ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ نکاح ثانی کو معیوب سمجھتی تھیں تاہم سید صاحب نے مسلسل دو تین ماہ کی کوشش کے بعد بڑے بھائی کی نوجوان بیوہ پر کمند ڈال لی۔ [۱] مولانا اشرف علی تھانوی کی مصدقہ اور محشی کتاب ارواح ثلاثہ میں اسی نکاح کے بارے میں لکھا ہے کہ

سید صاحب نے شادی کی تھی۔ نماز میں کچھ دیر سے آئے۔ مولوی (عبدالحی) صاحب نے سکوت کیا کہ شاید نئی شادی کی وجہ سے اتفاقیہ کچھ دیر ہو گئی۔ اگلے دن پھر ویسا ہی ہوا کہ سید صاحب کو اتنی دیر ہو گئی کہ تکبیر اولیٰ ہو چکی تھی۔ مولوی عبدالحی نے سلام کے بعد کہا کہ "عبادت الٰہی ہو گی یا شادی کی عشرت"۔ [۲]

یعنی سید صاحب اس شادی میں ایسے محو ہوئے کہ مرید صادق مولانا عبدالحی کو آواز کسنا پڑی۔ سید صاحب کی اس احیاء سنت کے بعد شاہ اسمعٰیل نے اپنی بیوہ ہمشیرہ سیدہ رقیہ کا نکاح زبردستی مولانا عبدالحی بڈھانوی سے کر دیا۔ [۳] کہتے ہیں ان دو

نکاحوں سے پورے ہندوستان کی کایا پلٹ گئی اور ہزاروں رانڈ عورتوں کے نکاح ثانی ہو گئے۔ ہوسکتا ہے لیکن حالات وواقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ بلکہ چراغ تلے اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔ سید صاحب کی تین بیویاں تھیں۔ سیدہ زہرہ، سیدہ ولیّہ، سیدہ فاطمہ۔ تینوں کی تاریخ وفات یہ ہے۔

۱۔ سیدہ زہرہ، متوفیہ ۴ شوال ۱۲۷۹ھ (۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء)[۴]

۲۔ سیدہ ولیّہ، متوفیہ ۱۸ رجب ۱۲۶۲ھ (۱۲ جولائی ۱۸۴۶ء)[۵]

۳۔ سیدہ فاطمہ، متوفیہ ۱۹۰۰ء[۶] (ان کا تعلق شیعہ کے اسماعیلی فرقہ سے تھا)۔

سید صاحب کے انتقال کے بعد سیدہ زہرہ ۳۲ سال، سیدہ ولیّہ ۱۶ سال اور سیدہ فاطمہ ۶۹ سال تک بیوہ رہیں اور کوئی نکاح نہ کیا۔ یہی حال سید صاحب کی دونوں صاحبزادیوں کا ہے۔

۱۔ سیدہ سائرہ کا نکاح سید اسمٰعیل بن اسحٰق سے ہوا دونوں کی تاریخ وفات یہ ہے۔

سید اسمٰعیل (بن اسحٰق) ۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۰ھ (۲۰ اکتوبر ۱۸۶۲ء) کو فوت ہوئے۔ سیدہ سائرہ ان کے بعد ۲۸ رجب ۱۳۰۱ھ (۲۶ مئی ۱۸۸۴ء) بروز پیر فوت ہوئیں۔[۷]

۲۔ دوسری لڑکی سیدہ ہاجرہ کا نکاح سید محمد یوسف سے ہوا۔ سید محمد یوسف ۱۶ شوال ۱۲۶۶ھ (۲۵ اگست ۱۸۵۰ء) کو فوت ہوئے۔ سیدہ ہاجرہ ان کے بعد ۶ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ (۲ نومبر ۱۸۵۹ء) کو فوت ہوئیں۔[۸]

سیدہ سائرہ ۲۱ سال اور سیدہ ہاجرہ ۱۰ سال تک بیوہ رہیں اور نکاح ثانی نہیں کیا۔ قلمی جانثاروں کے قول کہ ”سنت کا احیاء ہوا۔ اور ہزاروں نکاح ثانی ہوئے“ کی حقیقت واضح ہوگئی کہ جب بیویوں اور بیٹیوں نے نکاح ثانی نہیں کیا تو اور لوگوں

نے کیا کیا ہوگا۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

مولانا عبدالحئ بڈھانوی کی دو بیویاں سیدہ رقیہ اور اپنی چچا زاد بہن بیوہ ہو گئی[۹]۔ ان کا نکاح ثانی نہ ہوا۔ مولانا جعفر علی نقوی (مرید خاص سید صاحب) کا انتقال رمضان ۱۲۸۸ھ (نومبر ۱۸۷۱ء) میں ہوا[۱۰] اور ان کی دو بیویاں بیسویں عیسوی صدی کے اوائل تک زندہ رہیں[۱۱]۔ گویا ۳۵ سال بیوہ رہیں اور نکاح نہ کیا اسی طرح شاہ اسمٰعیل دہلوی کی اہلیہ سیدہ کلثوم کے نکاح ثانی سے تذکرہ نویس خاموش ہیں۔

اس کے علاوہ سید صاحب کے ایسے بے شمار خلفاء مجاز ہیں۔ جن کی بیواؤں کا نکاح ثانی نہ ہوا لیکن ''احیاء سنت کی تحریک'' حرکت میں نہ آئی۔

اور جب سرحدی مسلمانوں کی خواتین کا معاملہ آتا ہے تو رانڈ تو الگ رہیں دوشیزاؤں کو پکڑ پکڑ کر زبردستی سنتِ نکاح کا احیاء کیا جاتا ہے اور رانڈ عورتوں کے مکانات کو آگ لگانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ سید صاحب کے مرید خاص اور پشاور کے قاضی کا حکم ملاحظہ کیجئے۔

مولوی مظہر علی نے یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصے میں ملک پشاور میں جتنی رانڈیں (خواتین) ہیں سب کے نکاح ہو جانے ضروری ہیں ورنہ کسی گھر میں بے نکاح رانڈ رہ گئی تو اس گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔[۱۲]

اسلامی نظام عدل میں اپنے، بیگانے، امیر اور غریب کی کوئی تفریق نہیں۔ امیر المؤمنین کے اہل و اولاد اور رعایا کی اہل و اولاد ایک ہی حکم میں ہوتے ہیں۔ سید صاحب کی دو بیویاں بیوہ رہیں اور تیسری زوجہ محترمہ ۶۹ سال تک بیوہ رہیں۔ ان

کی صاحبزادیاں ۱۲اور ۱۰سال تک بیوہ رہیں۔ کسی دینی حمیت رکھنے والے قاضی یا مجاہد نے مکان کو آگ لگانے کا اعلان نہ کیا نواب ٹونک سے جاگیر کے عطیہ کے بجائے نکاح ثانی کی تبلیغ کسی نے نہ کی۔ آخر کیوں؟

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

---

۱ سید محمد علی مخزن احمدی ص ۴۵
۲ اشرف علی تھانوی۔ مولانا۔ ارواح ثلثہ ص ۱۴۲
۳ سید محمد مخزن علی۔ مخزن احمدی۔ ص ۴۵
۴ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۲۲
۵ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۸۲۳
۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۲۴
۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۸۲۴
۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۲۴
۹ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین ص ۱۱۶
۱۰ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین ص ۲۱۳
۱۱ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین ص ۳۱۰
۱۲ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۲

اعلانِ حج

سید صاحب نے مشائخ کی طرح دورے شروع کئے۔ لوگوں کا رجوع نہ دیکھ کر مفت حج کرانے کا اعلان کیا۔ پھر سوانح نگاوں کے قول کے مطابق ہزاروں اور لاکھوں افراد سید صاحب کے دامن گرفتہ ہو گئے لیکن مفت حج والے بھی ساڑھے سات سو سے زیادہ نہ ہو سکے۔ تاہم سید صاحب کو چندہ کا موقع خوب ہاتھ آیا۔ اس لئے مفت حج کرانے کے نام پر لاکھوں روپے جمع کئے اپنی ازواج اور خاندان کے دیگر افراد کو بھی مفت حج کرایا اور بعض کو مفت حصول سعادت کیلئے زبردستی ساتھ لے گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ امراء کو لے کر جاتے جن پر حج فرض تھا لیکن ان سے چندہ لینے پر اکتفاء کیا اور پراگندہ حال لوگوں کو جن پر حج فرض نہیں تھا اپنے ساتھ لے لیا۔

سید صاحب کیمیا گر تھے:

مگر حصول زر کیلئے مکہ مکرمہ جیسے مقام پر بھی کیمیا گری کرتے رہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی نے فرمایا کہ

مکہ معظمہ میں سید قاسم صاحب ایک بزرگ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں تھے۔ اچھے بزرگ تھے۔ جب میں ان سے ملا تو مجھ سے فرمانے لگے کہ ہم نے سید صاحب کے شامل دھڑیوں سونا بنایا ہے۔ تم (بھی) سیکھ لو[۱]۔

کیمیا گری کا پیشہ شرعی طور پر درست ہے یا نہیں۔ یہ تو سید صاحب کے معتقدین علما ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن بظاہر یہ دھوکہ ہے اور وہ بھی مسلمانان مکہ سے۔

حرم کا مؤذن رجیم ہے:

خیر سید صاحب مکہ مکرمہ پہنچے۔ اور اپنے روز وشب بیت اللہ کے سایہ میں گزارنے

لگے۔ آپ کے ایک مرید مولوی عبدالحق نیوتنوی کم علم اور بڑے تیز مزاج تھے۔
مولانا عبدالفتاح گلشن آبادی لکھتے ہیں کہ انہوں نے حرم مکہ کے مؤذن کو"رجیم" کہا۔

صبح کی اذان کے اول حرم محترم کے اطراف کے میناروں پر مؤذن چڑھ کر
درود اور سلام بآواز بلند پڑھتے ہیں (مولوی عبدالحق) اس کو رجیم کہتے ہیں۔[۲]

بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے والوں کو آج بھی سید صاحب کے متوسلین
"رجیم" کا لقب دیتے ہیں۔ چنانچہ مولوی صاحب پر وہابیت کا الزام عائد ہوا تو مولانا
عبدالحی بڈھانوی نے حیلہ سازی سے کام لے کر خلاصی کرائی۔

حرم مکہ میں الگ جماعت:

سید صاحب ہر معاملہ میں اپنا ایک الگ تشخص قائم کرنے کی کوشش میں
ہوتے۔ حرم شریف میں بھی یہی حال تھا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔ سید صاحب نے
مریدوں کو حکم دیا۔ جب دوسرے لوگ فارغ ہو جائیں تو اپنی جماعت کھڑی ہو۔[۳]

اس کی کوئی بھی وجہ ہو تاہم جماعت اولیٰ ترک کرنا ازدیادِ ثواب سے محروم ہونا
ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ امام صاحب کا عقیدہ سید صاحب کے عقیدے سے مختلف
ہوگا۔ اس لئے جماعت اولیٰ کو ترک کر دیا ہوگا۔ اس وقت حجاز مقدس پر ترکی خلفاء کی
حکومت تھی جو عقیدتاً سنی حنفی تھے۔ اس لئے یہ احتمال قوی معلوم ہوتا ہے۔

اہل حرمین بدعتی ہیں:

سید صاحب نے پنجتار سے روانگی کے وقت اپنی ازواج کے بارے میں وصیت کی کہ

"(اگر پیمانہ زندگی ما درہمیں عبادت پر شود پس شمارا ضروراست کہ بسوئے
حرمین شریفین بروند و برمقام دیگر ہرگز توطن نہ سازند")[۴]

ترجمہ:۔ اگر اس جہاد میں میرا جام حیات سے لبریز ہو جائے تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ حرمین شریفین چلی جاؤ اور کسی دوسری جگہ توطن اختیار نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اپنی ازواج کے نکاح ثانی پر راضی نہ تھے ورنہ وصیت یہ فرماتے میرے انتقال کے بعد نکاح ثانی کرنا اور اپنے شوہروں کے ساتھ رہنا۔ اور یہ صورت بھی ہو سکتی تھی کہ فرماتے کہ حرمین جا کر نکاح ثانی کر لینا۔ دوسروں کی رانڈ عورتوں کے زبردستی نکاح کرانے والے سید صاحب اپنے معاملہ میں بڑے مصلحت پسند واقع ہوئے۔

حرمین شریفین سے اتنی عقیدت کے باوجود اہل حرمین کو بدعتی کا خطاب دیتے ہوئے گھبراہٹ محسوس نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں۔

وہی سرزمین ہے۔ جہاں دین خلل سے محفوظ رہے گا۔ اگرچہ بدعات سے وہ ملک بھی خالی نہیں۔[۵]

اس لئے بدعات سے خالی نہیں ہے کہ وہاں کے لوگ اس وقت سنی حنفی مسلمان تھے اور ترک خلفاء کی حکومت تھی۔ بعد میں سنی مسلمانوں کو شاہ سعود نے زبردستی ''نجدی'' بنالیا۔

۱؎ عاشق الٰہی میرٹھی۔ مولوی۔ تذکرۃ الرشید ص ۲۸۵

۲؎ عبدالفتاح گلشن آبادی۔ مولانا۔ تحفہ محمدیہ ص ۱۱۸

۳؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۲۲

۴؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۰۵

۵؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۰۳

انگریزوں سے تعلقات

سید صاحب نے حج سے واپسی کے بعد سکھوں سے جہاد کا اعلان کیا اس دوران وہ انگریزوں کی عمل داری میں جہاد کیلئے چندہ اور آدمی جمع کرنے کیلئے دورے کرتے رہے لیکن انگریزون نے ان کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز ان معنی میں سید صاحب کی سرگرمیوں سے آگاہ اور مطمئن تھے کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے۔ ہمارے خلاف نہیں۔ ورنہ اپنے علاقہ میں چندہ، اسلحہ اور آدمیوں کی فراہمی کی اجازت انگریز ایسی زیرک اور چالاک قوم نہیں دے سکتی تھی۔ جبکہ انگریز خود نو وارد تھے اور ہندوستان میں آہستہ آہستہ اپنے پیر جما رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کا انگریز سے رابطہ سکھوں سے جہاد کی تیاری سے بہت پہلے کا تھا جبکہ سید صاحب کا امیر خاں (جو بعد میں نواب ٹونک کہلائے) کی فوج میں ملازم تھے۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

۱۲۱۳ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی اور آپ ہی کے ذریعے سے جو شہر بعد ازاں دیئے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے دینے طے پائے تھے۔ لارڈ ہسٹینگ سید احمد کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ جس میں امیر خاں لارڈ ہسٹینگ اور سید احمد شامل تھے۔

سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا۔

آپ نے اسے یقین دلایا کہ انگریز سے مقابلہ کرنا اور ان سے لڑنا بھڑنا اگر

تمہارے لئے برانہیں ہے تو تمہاری اولاد کیلئے سم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے در پے تنزلی کا شکار ہیں تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا اور ان کو عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابل میں کون میدان جنگ میں لاکے جمائے گا۔ یہ باتیں امیر خان کی سمجھ میں آ گئی تھیں اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کیلئے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں آرام سے بیٹھوں۔ امیر خان نے ریاستوں اور ان کے ساتھ انگریزوں کا بھی ناک میں دم کر دیا تھا۔ آخر ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری سے ہر ریاست سے کچھ کچھ حصہ دے کے امیر خاں سے معاہدہ کرلیا۔ جیسے جی پور سے ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج اس طرح سے متفرق ہو گئے مختلف ریاستوں سے بڑی قیل وقال کے بعد انگریزوں سے دلوا کے بپھرے ہوئے شیر کو اس حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا۔[۱]

سید صاحب نے امیر خان ایسے مخالف انگریز کو ''وائی ٹونک،، بنا کر انگریز کے پنجے میں جکڑ دیا۔ اور انگریزی حکومت ان کی کارگزاری پر بڑی خوش تھی۔ اسی لئے سکھوں سے جہاد کی تیاری میں آڑے نہ آئی۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

اس وقت ہر شہر، قصبہ وگاؤں پر برٹش انڈیا یعنی انگریز عملداری واقع تھی ہند میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا واعظ ہوتا تھا مگر براہ دوراندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد کے نواب لیفٹنٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی ومغربی کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریز کی عملداری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔[۲]

مرزا حیرت دہلوی بھی اسی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سید احمد نے عام طور پر دھڑا کے سے اپنے مریدوں کو ہر شہر میں یہ اجازت دے دی کہ سکھوں پر جہاد کرنے کے وعظ ہوں۔ اکثر شہروں میں وعظ ہونے شروع ہوئے۔..........لوگوں کے دلوں میں تحریک پھیل رہی تھی اب عام طور پر ظاہر ہونے لگی اور سید صاحب کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے۔ سید احمد صاحب نے مولانا شہید کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کرنے کی تیاری کرنے کو ہیں۔ سرکار کو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہے۔ لیفٹننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عملداری کے امن میں خلل نہ پڑے ہمیں کچھ سروکار نہیں نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔[۳]

جناب شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔

انگریزوں نے اس وقت سید صاحب کے اس اعلانیہ جہاد اور اس کی تیاری میں کوئی رکاوٹ نہ کی۔[۴]

ایک اور اہل حدیث مولانا فضل حسین بہاری رقمطراز ہیں۔

آپ (شاہ اسمٰعیل) اپنے شیخ طریقت سید احمد صاحب کو امام تسلیم کر کے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ جہاد کیلئے پنجاب پہنچے تو گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی آپ کے اس ارادے میں کسی طرح کی مزاحمت یا پیچیدگی پیدا نہیں کی۔[۵]

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہی کہ انگریزی حکومت نے سید صاحب کو بہ خوشی اجازت دے دی کہ وہ سرکار انگریزی کے علاقہ میں سکھوں سے جہاد کیلئے چندہ، رقم اور آدمی جمع کریں۔ اگر سید صاحب کے انگریز حکومت سے دیرینہ تعلقات نہ ہوتے یا انہیں سید صاحب سے اپنی مخالف کا خفیف سا اندیشہ بھی ہوتا تو وہ کبھی ایسے جہاد کی اجازت نہ دیتے بلکہ انگریزی حکومت کو سید صاحب سے اپنی دوستی کا اتنا محکم

یقین تھا کہ شکایت کے باوجود کوئی توجہ نہ کی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

عظیم آباد (پٹنہ) کے بعض شیعہ صاحبان نے انگریز حاکم سے جا کر کہا کہ یہ سید صاحب جو یہاں اتنے آدمیوں کے ساتھ آئے ہیں ہم نے سنا ہے کہ ان کی نیت جہاد کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے جہاد کریں گے۔ حاکم نے اس کو تعصب اور حسد پر محمول کیا اور ان کو تنبیہہ کی کہ آئندہ ایسی مفسدانہ بات نہ کہی جائے۔[۶]

شکایت کے باوجود انگریز حاکم نے اس الزام کو رد کر دیا اور تنبیہہ کر دی کہ آئندہ سید صاحب کی شان میں ایسی گستاخی نہ کی جائی۔

ایک مرتبہ تو خود حکام نے اعلیٰ حکام سے سید صاحب کی جہادی سرگرمیوں کی شکایت کی اور کیا جواب ملا۔ سنیے۔

''جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے احکام اس سے چوکنے ہوئی اور انہیں خوف معلوم ہوا کہ کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور اس میں تو کسی قسم کا خلل آکے واقع نہ ہوگا۔ اس نظر سے ضلع کے حکام نے حکامِ اعلیٰ کو لکھا وہاں سے جواب آ گیا۔ ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو۔ ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔[۷]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اندرون خانہ انگریزوں کو مکمل اطمینان دلا رکھا تھا کہ یہ تیاری آپ کے نہیں سکھوں کے خلاف ہے۔ ورنہ حکام اعلیٰ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے اور آج ڈیڑھ سو سال بعد بعض لوگ سید صاحب پر انگریز دشمنی کا اتہام لگاتے ہوئے خوفِ آخرت محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ سید صاحب کو انگریز حکومت سے اتنی دلبستگی اور تعلق قلبی تھا

کہ جہاں سکھ دشمنی کی تبلیغ کرتے ساتھ ہی انگریز دوستی کو بھی واضح الفاظ میں بیان کرتے۔ مشہور اہل حدیث مولوی عبدالرحیم صادق پوری لکھتے ہیں۔

سید احمد صاحب کی برابر روش یہ رہی ہے کہ ایک طرف لوگوں کو سکھوں کے مقابل آمادہ جہاد کرتے اور دوسری جانب حکومت برطانیہ کی امن پسندی جتا کر لوگوں کو اس کے مقابلے سے روکتے تھے۔[۸]

عبارت یہ بتاتی ہے کہ لوگ اس وقت انگریز سے آمادہ جہاد تھے لیکن سید صاحب اپنی محبوب اور امن پسند انگریزی حکومت سے لوگوں کا رخ سکھوں کی طرف موڑ رہے تھے تا کہ ان کو ہندوستان پر قبضے میں آسانی رہے۔ وہ لوگ جو سید صاحب کو انگریز دشمن ظاہر کرتے ہیں وہ سید صاحب کے دشمن تو ہو سکتے ہیں محبّ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کیونکہ سید صاحب انگریز دوست تھے اور یہ سید صاحب کو انگریز دشمن کی صورت دیتے ہیں۔ سید صاحب کے خلیفہ دوم شاہ اسمٰعیل دہلوی جو سید صاحب کے ہم پیالہ وہم نوالہ بھی تھے سید صاحب کی اتباع میں انگریز سے کیسی محبت کرتے تھے۔

مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیام کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسمٰعیل شہید وعظ فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریزی سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں۔[۹]

اسی طرح مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور

سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں۔ایک تو ان کی رعیت ہیں۔دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔[۱۰]

مندرجہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی ضرورت تھی اور لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ کوئی انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرے اسی لئے ایک دوربین آدمی نے یہ سوال شاہ اسمعیل کو انگریز کی بڑھتی ہوئی طاقت کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے کیا۔شاہ اسمعیل نے سائل کی اصلی لم اور غرض کو سمجھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ اگر انگریزی حکومت پر کوئی حملہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے جنگ کریں۔دیکھئے انگریزی حکومت سے کتنی محبت والفت ہے کہ تمام مسلمانوں پر انگریز کی اعانت وامداد فرض قرار دے رہے ہیں۔ایسے انگریز دوست بزرگ پر جب لوگ انگریز دشمنی کا الزام عائد کرتے ہوں گے تو ان کی روح کو اذیت پہنچتی ہوگی۔

جناب شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

''جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے۔کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ اتنے دور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہو،انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں وہ دین اسلام کے کیا منکر نہیں ہیں۔گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے

گا۔..........سید صاحب نے جواب دیا سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔" [۱۱]

کتنا واضح سوال اور کتنا ہی واضح جواب ہے اب بھی اگر کوئی سید صاحب کو انگریز دشمنی کا طعنہ دے تو اسے خللِ دماغ ہی کہا جاسکتا ہے۔

مولانا منظور نعمانی کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ الفرقان کا اعتراف سنیے۔

مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔ [۱۲]

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نعمانی زبانِ خلق کو نقارہ خدا تصور کرنے میں تامل کر رہے ہیں جبکہ مشہور بھی یہی ہے اور اصل واقعہ بھی یہی ہے۔ اگر واضح حقیقت بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر ہم بارگاہ الٰہی میں اس کی دماغی صحت کیلئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔

مولانا جعفر تھانیسری سید صاحب کی خدمات کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سید صاحب کا سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کا ارادہ ہرگز نہ تھا وہ اس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار انگریزی اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ امداد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔ [۱۳]

مولانا تھانیسری نے حقیقت بالکل آشکارا کر دی کہ انگریز اس وقت سکھوں کا

زور کم کرنا چاہتے تھے اس لئے سید صاحب ان کے علاقہ میں سکھوں سے جہاد کے لئے اسلحہ اور آدمی آزدانہ طور پر جمع کرتے رہے۔ انگریز نے نہ روکا، نہ رکاوٹ ڈالی بلکہ امداد واعانت بھی کی اور جب یہ مجاہدین سکھوں سے جہاد کیلئے سرحد گئے تو ان کے بیوی بچوں اور املاک کی پوری پوری حفاظت کی اور بعد میں ہندوستان سے جو مالی اور افرادی اعانت ہوتی رہی اس میں بھی رخنہ اندازی نہیں کی۔

اگر سید صاحب سرحد میں جا کر انگریزی حکومت سے جہاد کا اعلان کرتے تو انگریز مجاہدین کے بیوی بچوں کو گرفتار کر لیتے ان کے رشتہ داروں کو تکلیف اور اذیت پہنچاتے اور جائیداد ضبط کر لیتے لیکن ایسا نہ ادھر سے ہوا اور نہ ادھر سے کاروائی ہوئی۔

مولانا محمد میاں دیوبندی کا نقطہ نظر بھی معلوم کر لیں شاید قبول حق کی توفیق ہو جائے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

جب تک اس تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف اتنا رہا کہ رنگروٹ بھرتی کئے جائیں اور سرمایہ فراہم کیا جائے تو انگریزی حکومت کے ذمہ داروں نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا بلکہ انگریزوں نے اس کی حمایت کی۔ [۱۴]

دیوبندی مکتبہ فکر کی اس سے بڑی شہادت ملاحظہ کیجئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر اور دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی فرماتے ہیں۔

جب سید احمد صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور جنگی ضرورتوں کو مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔ [۱۵]

کیا دیوبند کے شیخ الحدیث کا بیان جھوٹا ہے۔ کیا انہوں نے کتمانِ حق کیا ہے یا حقیقت سے بے خبر تھے یہ اور اس قسم کے کئی سوال ذہن میں اس وقت ابھرتے ہیں

جب سید صاحب کے جہاد کا رخ سکھوں کے بجائے انگریز کو قرار دیا جائے۔

اس وقت انگریزوں کے پیش نظر مسلمان اور سکھ دو بڑی طاقتیں تھیں جن سے نبرد آزمائی جان جوکھم کا کھیل تھا۔ انگریز نے بڑی عیاری سے سید صاحب کے کام میں امداد کی تا کہ دونوں مقامی طاقتیں آپس میں ٹکرا کر یا تو ختم ہو جائیں یا کمزور ہو جائیں اگر ایک طاقت ختم ہو جاتی تو انگریز یک سوئی سے دوسری کو زیر کرنے کی تدبیر کرتا اور دونوں کمزور ہوتیں تو بھی فائدہ انگریز ہی کا تھا۔

مسلمان سکھوں سے ٹکرانے کے بعد مذہبی اختلاف کی وجہ سے آپس میں الجھے اور ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں اپنا قصہ تمام کر لیا۔

اب انگریزوں کے سامنے صرف سکھ باقی رہ گئے تھے۔ ان سے سرحدی امن کا معاہدہ کیا اور بعد میں دوسرے معاہدہ کے تحت پنجاب پر قبضہ کر لیا جو ڈیڑھ سو سال تک باقی رہا۔

سید صاحب کی تحریک سے انگریزوں کو فوری فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور سکھوں کی توجہ انگریز سے ہٹ کر ایک دوسرے پر لگ گئی اور انگریز کو پیر جمانے کا موقع مل گیا۔

زبان خلق : حق چھپائے چھپتا نہیں۔ ایک روز ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ سید صاحب نے مصلحت کے تحت انگریزوں سے اپنے روابط اور تعلقات کو چھپانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ سید صاحب جہاں بھی گئے انگریز دوستی کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

کارو (سندھ) میں سید چورن شاہ ایک ممتاز بزرگ تھے۔ سید صاحب کے حکم سے سید حمید الدین اور سید اولاد حسن نے ان سے ملاقات کی۔ وہ سید صاحب سے

ملاقات کیلئے آئے اور ایک بڑا بھینسا بطور نذرانہ پیش کیا۔انہیں سے معلوم ہوا کہ لوگ عام طور پر سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھتے ہیں۔اسی لئے بدکتے ہیں۔[۱۶]

آخر عام لوگوں میں جو شہرت ہوئی تو اس کی کوئی بنیاد ضرور ہے۔ اسی بنیاد کو سید صاحب اپنے خیال میں چھپائے ہوئے تھے لیکن سندھ کی طرح سرحدی لوگ بھی اس راز سے واقف ہو گئے تھے۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے کہا:۔

انگریزوں نے انہیں (سید صاحب کو) تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔[۱۷]

سید صاحب ایک وفد میاں جی محی الدین چشتی کی سرکردگی میں شاہ بخارا کے پاس حصول امداد کیلئے بھیجا چونکہ انگریز دوستی کی خبر وہاں بھی پہنچ چکی تھی اس لئے ناکامی ہوئی۔

معلوم ہوا کہ وہاں کے درباریوں نے غلط بیانیوں کے ذریعے (شاہ بخارا) کو بدظن کر دیا ہے۔ غلط بیانی یہ تھی کہ سید صاحب جہاد کیلئے نہیں آئے بلکہ انگریزوں نے اپنا جال وسط ایشیا میں پھیلانے کی غرض سے انہیں بھیجا ہے۔لہٰذا ان کی امداد نہ کرنی چاہئیے۔[۱۸]

سید صاحب خود بعد میں پہنچتے ہیں انگریز دوستی کی شہرت پہلے پہنچ جاتی ہے کیا عام لوگ اس شبہ میں حق بجانب تھے یا نہیں۔محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں۔

جب حضرت شہید بہ عزم جہاد صوبہ سندھ اور سرحد کے علاقے میں داخل ہوئے (جو اس وقت انگریزی عملداری میں نہ تھے) تو ان کے متعلق عام طور سے یہ شبہ کیا گیا کہ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں اور یہ شبہ اس بنا پر کیا گیا کہ حضرت شہید کے تعلقات انگریزوں سے نہایت درجہ خوش گوار تھے۔[۱۹]

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے انگریزوں سے مراسم کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ سندھی اور سرحدی مسلمانوں کا شبہ حقائق پر مبنی تھا۔

آج جو لوگ سید صاحب کو انگریز دشمن ثابت کرنے کیلئے ناجائز طریقے استعمال کررہے ہیں۔ کذب وافتراء سے کام لے رہے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ صمیم قلب سے اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ سید صاحب انگریز دوست تھے اور انہوں نے کبھی انگریزوں سے کسی قسم کی مخاصمت مول نہ لی۔

---

۱ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۲۱
۲ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمدی ص ۱۶۸
۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۳۱
۴ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر ص ۱۸
۵ فضل حسین بہاری۔ مولانا۔ الحیات بعد الممات ص ۲۰۳
۶ ابوالحسن ندوی۔ سیرت سید احمد شہید جلد اول ص ۲۴۲
۷ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۳۰
۸ عبدالرحیم صادق پوری۔ الدر المنثور ص ۲۵۲
۹ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمدی ص ۱۷۱
۱۰ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۲۳
۱۱ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر ص ۲۰
۱۲ منظور نعمانی۔ مولانا۔ الفرقان لکھنؤ شہید نمبر ۱۳۵۵۔ ص ۷۶
۱۳ محمد جعفر تھانیسری۔ مولانا۔ سوانح احمدی ص ۱۳۹
۱۴ محمد میاں۔ مولانا۔ علماء ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم ص ۲۴۱
۱۵ حسین احمد مدنی۔ مولانا۔ نقش حیات جلد دوم ص ۱۲
۱۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۸۴
۱۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۸۴
۱۸ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین ص ۱۸۸
۱۹ حاشیہ مقالات سرسید۔ حصہ شانزدہم ص ۲۵۱

﴿ایک شبہ کا ازالہ﴾

سید صاحب کے سوانح نگاروں میں جناب غلام رسول مہر پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ نکتہ اٹھایا کہ سید صاحب دراصل انگریزوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ سکھ تو بس یوں ہی سامنے آ گئے۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ وہ سوانح نگار جو سید صاحب کے قریب العہد تھے اور غلامان صادق و باوفا بھی تھے۔ وہ سب اس بات کے قائل تھے کہ سید صاحب سکھوں سے جہاد کیلئے ملہم باللہ تھے۔ اور انگریزوں کے خلاف کوئی چیز سید صاحب سے منقول نہیں۔ ہم اس سلسلہ میں سید صاحب کے قریب العہد مؤرخین کی کتب سے ناقابل تردید ثبوت پیش کر چکے ہیں لیکن جناب مہر نے مرزا حیرت اور مولانا تھانیسری پر یہ کہتے ہوئے تحریف کا الزام عائد کیا کہ وہ انگریزوں سے دب گئے تھے۔ جس کا جواب بھی از حد ضروری ہے۔ لکھتے ہیں۔

اس کتاب (سوانح احمدی) نے سید صاحب کے متعلق دو نہایت افسوسناک غلط بیانیوں کو عام کیا۔ اول یہ کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔[۱]

مرزا حیرت دہلوی کی حیات طیبہ کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

یہ کتاب تاریخ نہیں افسانہ ہے۔ کئی واقعات و حالات بداہتہً ایسے ہیں جو مرزا صاحب نے خود تیار کر لئے۔[۲]

سید صاحب کے دونوں سوانح نگار مولانا جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی سید صاحب کے نہایت قریب العہد ہیں اور مطبوعہ مواد ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بہت اہم ہیں۔ لیکن مہر صاحب کے نزدیک ''سینہ گزٹ'' کا سلسلہ بھی ہے جو قلمی صورت

میں ان کے یا ان کے ہم خیال افراد کے پاس ہے وہ ان دونوں کتابوں سے زیادہ اہم ہے۔اس کی ایک مختصر فہرست انہوں نے ''سید احمد شہید'' کے شروع میں دی ہے لیکن ارباب علم ونظر پر مہر صاحب کی دیانتداری عیاں ہے۔اس لئے ''دفینہ سینہ'' کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

حیات طیبہ: ان دونوں مطبوعہ کتابوں پر مہر صاحب کی اتہام بازی اور الزام تراشی بایں وجہ ہے کہ ان میں صراحتہً یہ مذکور ہے کہ سید صاحب کو سکھوں سے جہاد کیلئے الہام ہوا تھا اور یہ بات مہر صاحب کی تحقیق کے خلاف ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سید صاحب انگریزوں سے جہاد کا ارادہ رکھتے تھے (اگر چہ واقع میں ایسا نہ ہوسکا) اور یہ دونوں سوانح نگار انگریز کے حامی اور خیر خواہ تھے۔اسلئے سید صاحب کے نکتہ نظر میں تبدیلی کردی۔اگر مہر صاحب کی یہ بات صحیح ہے تو مرزا صاحب کو انگریز کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ بلکہ وہ اسی کتاب میں مشہور انگریز مؤرخ ڈاکٹر ہنٹر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اس تحریر سے ڈاکٹر ہنٹر کی اصلی معاملات سے بے خبری اور خیالی پلاؤ پکانے اور ایک معاملہ پر فرضی رائے قائم کرنے کا پورا حال کھلتا ہے''۔[۳]

دوسری جگہ لکھتے ہیں

''ان کی ۲۱۸ صفحے کی کتاب غلطیوں کے انبار سے جیسے بھری ہوئی ہے۔اسی طرح بے جا تحکم اور غلط منطق کی ہر جگہ جھلکی پائی جاتی ہے۔کاش اگر کچھ بھی انصاف ہوتا تو وہ مظلوم مسلمانوں کو ایسا متہم نہ کرتے۔''[۴]

اگر مرزا حیرت انگریز سے مرعوب ہوتے تو کبھی بھی ڈاکٹر ہنٹر اور ان کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کی مذمت اور تحقیر اتنے واضح الفاظ میں نہ کرتے۔اگر

وہ یہ کر سکتے ہیں تو سید صاحب کے جہاد کو سکھوں کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اگر حقیقت ایسی ہی ہوتی جیسے مہر صاحب کا خیال ہے تو مرزا حیرت دہلوی اس کا

بھی ضرور ذکر کر دیتے۔ جب کہ مرزا صاحب کا اپنا بیان یہ ہے کہ میں نے ''خوف آخرت'' کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔ لکھتے ہیں۔

میں محققانہ طور پر لکھ رہا ہوں اور یہ بھی میرے پیش نظر ہے کہ ایک دن مجھے اپنے قہار خالق کی خدمت میں حاضر ہو کے اپنی کل تحریرات کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اسلئے میرا فرض ہے کہ جو کچھ لکھوں ایمان اور خوش نیتی سے انصافاً تحریر کروں۔[۵]

لیکن مہر صاحب، مرزا حیرت کو کذاب اور ان کی کتاب کو افسانہ قرار دیتے ہیں اور مرزا صاحب کی اس عبارت جیسی کوئی عبارت مہر صاحب کے ذخیرہ تصنیفات میں نہیں ہے۔ مرزا صاحب تو ان مسلمانوں سے بھی نالاں ہیں جو انگریزوں کی تحریر پر اعتماد کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

سب سے زیادہ ان پر افسوس آتا ہے کہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن میں معاذ اللہ کذب کو جگہ ہو سکتی ہے۔ مگر انگریز کے ہاتھ کا لکھا ہوا کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ خدا ان پر رحم کرے اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھائے۔[٦]

میرے خیال میں ایسے شخص کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ سید صاحب انگریزوں سے جہاد کا ارادہ رکھتے تھے لیکن مرزا حیرت نے انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر سید صاحب کے جہاد کو صرف سکھوں سے خاص کر دیا ناانصافی ہو گی۔

مرزا صاحب نے ڈاکٹر ہنٹر اور اس کی قوم کو غیر مہذب اور غیر شائستہ تک کہا لکھتے ہیں۔

جس کی یہ عجیب وغریب کیفیت ہو۔ اس کی نسبت ہنٹر جیسا مغربی عالم ناشائستہ الفاظ استعمال کرے، افسوس ہے۔ ان باتوں سے قائل کی نہیں بلکہ اس قوم کی تہذیب وشائستگی معلوم ہوتی ہے۔[۷]

جو شخص ڈاکٹر ہنٹر جیسے آئی سی ایس کو غیر مہذب کہہ سکتا ہے وہ انگریزوں سے سید صاحب کے جہاد کا بھی ذکر کر سکتا ہے۔ لیکن مہر صاحب فرماتے ہیں کہ وہ کذاب اور اس کی کتاب ''حیات طیبہ'' افسانہ ہے۔ یقیناً جواب نہ ہونے کی صورت میں انہی جیسے الفاظ کا سہارا لیا جا سکتا تھا۔

سوانح احمدی: جہاں تک مولانا تھانیسری کا معاملہ ہے تو وہ بڑی اہم شخصیت ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں۔

سید صاحب کی قائم کی ہوئی جماعت میں یہی ایک ذمہ دار آدمی ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی مزید لکھتے ہیں:۔

تمام ابتلاء وآزمائش میں ثابت قدم رہے اور اپنی ثابت قدمی سے عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کر دی۔[۸]

جناب غلام رسول مہر کو بھی یہ اعتراف ہے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری سید صاحب کے خاص معتقدین سے وابستہ تھے اس وابستگی کے باعث انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں۔ گھر بار لٹایا اور کم وبیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کئے۔ ان قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جانی چاہئے۔[۹]

مولانا حسن احمد مدنی لکھتے ہیں:۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری سیدؒ صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں۔[۱۰]

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

سوانح احمدی (اور تواریخ عجیبہ) اردو کی پہلی کتاب سید صاحب کے حالات میں مقبول و مشہور ہے۔ جس سے سید صاحب کے حالات کی بہت اشاعت ہوئی۔[۱۱]

سوانح احمدی کی تالیف کے سلسلہ میں مولانا تھانیسری کا اپنا بیان ملاحظہ ہو لکھتے ہیں۔ میں نے اس کتاب (سوانح احمدی) کو بڑے راست باز لوگوں کی متعدد تحریروں سے نقل کیا ہے۔ جنہوں نے ان واقعات کو خود دیکھا۔ میرے نزدیک اس کتاب کی کسی روایت میں دروغ گوئی یا مبالغہ کو کچھ دخل نہیں۔[۱۲]

مولانا مسعود عالم ندوی مولانا تھانیسری کی ثابت قدمی کو عہد صحابہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ غلام رسول مہر ان کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھکا رہے ہیں۔ مولانا مدنی اور مولانا ندوی انہیں مستند قرار دے رہے ہیں اور مولانا تھانیسری خود اپنی تحریر کو دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی سے پاک قرار دے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ ان پر یہ ''اتہام بازی'' کرتے ہیں کہ انہوں نے ''سوانح احمدی'' میں تحریف کی۔ سید صاحب انگریزوں سے جنگ لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ سید صاحب کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔ اور معترض بھی ''غلام رسول مہر'' ہیں۔ کیونکہ مہر صاحب کی خود ساختہ تحقیق سے مولانا تھانیسری کی تحقیق اور تحریر مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لئے مہر صاحب نے مولانا تھانیسری پر انگریز نوازی کا الزام عائد کر دیا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

مولانا تھانیسری نے اپنی دوسری کتاب ''تواریخ عجیبہ'' میں بھی انگریزوں پر تنقید کی اور ان کی سینہ زوری کی نشاندہی کی۔ لکھتے ہیں۔

ملک یاغستان میں خودسرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہوگئی۔[۱۳]

انگریزی دور میں لکھی جانے اور طبع ہونے والی کتاب میں مولانا تھانیسری جنگ امبیلہ یاغستان کو انگریز کی زیادتی، ظلم اور حماقت قرار دے رہے ہیں۔

مزید لکھتے ہیں۔

لارڈ ایلجن صاحب وائسرائے ہند چمبے کے پہاڑ پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مر گئے۔[۱۴]

میرے خیال میں ایسا شخص جو انگریزی دورِ عروج میں انگریز کو اتنی سنا سکتا ہے تو وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس پر انگریز نوازی کا الزام عائد کرتے ہوئے تحریف کا مرتکب قرار دینا مہر صاحب کی ''حرکت بے جا'' معلوم ہوتی ہے۔

---

۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۷ ۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۷

۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۲۱ ۴ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۲۲

۵ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۳۵ ۶ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۲۹

۷ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۰۲ ۸ پیام شاہ جہان پوری۔ شہادت گاہ بالاکوٹ ص ۳۰۸

۹ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۴۶ ۱۰ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات ص ۴۱۸

۱۱ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید بحوالہ شہادت گاہ بالاکوٹ

۱۲ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۵۱ ۱۳ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ تواریخ عجیب ص ۶۲

۱۴ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ تواریخ عجیب ص ۶۴

﴿سکھوں سے جہاد﴾

سید صاحب نے انگریز کے ایماواشارہ اورامداد سے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی چونکہ انگریزوں اور سکھوں میں سرحدی معاہدہ ہو چکا تھا۔ سید صاحب ہندوستانی سرحد سے پنجاب پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے سندھ وبلوچستان کے راستہ پشاور آئے اور جہادی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ سید صاحب اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

معاملہ ایں خاکسار کالشمس فی رابعتہ النہار ہوایدا وآشکارا است کہ بہ جہاد اہل عناد قوم سکھ ماموروم۔[۱]

ترجمہ:۔ اس خاکسار کا معاملہ ''کالشّمس فی رابعتہ النہار'' کی طرح واضح ہے کہ میں اہل عناد قوم سکھ سے جہاد کیلئے مامور ہوں۔

اس کی علاوہ ایک مرتبہ سکھوں سے جہاد کیلئے سید صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام بھی ہوا۔ فرماتے ہیں۔

اما بیان الہام پس از فقیر از پردہ غیب بہ بشارب ربانی باستیصال کفار دراز مویاں مراد است۔[۲]

سید صاحب کا الہام بتا رہا ہے کہ وہ ''کفار درازمویاں''یعنی سکھوں کے استیصال کیلئے مامور تھے۔ یہ تو سید صاحب کا اپنا بیان ہے جس میں کسی قسم کا شک اور تحریف نہیں اور نہ ہی آج تک کسی نے مندرجہ بالا عبارات پر تحریف کا الزام لگایا ہے۔ سید صاحب کی معتقدین اور متوسلین بھی یہی کہتے ہیں کہ سید صاحب سکھوں کے خلاف تھے اور انہی سے جہاد کا ارادہ رکھتے تھے اور اسی لئے سرحد گئے تھے۔

مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

آپ کے سفر جہاد سے پہلے آپ کو یہ الہام ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کی ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان متواتر وعدہائے فتح سے آپ کا ہر ایک مرید واقف تھا۔[۳]

دریائے ستلج تک ہی سکھوں کی حکومت تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الہام ربانی سکھوں کے بارے میں تھا۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت اس الہام ربانی میں شامل نہ تھی مزید یہ کہ سید صاحب کا ہر مرید اس الہام ربانی سے واقف تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف تھے وہ سید صاحب کے الہام اور روحانی عظمت کے منکر ہیں۔ مزید سنیے۔

ان حالات کی موجودگی میں کہ انگریزی سرکار کارفرما تھی مگر اس کی مسلمان رعایا کی آزادی اور سرکار انگریزی کی بے روریائی اور ان حالات کی موجودگی میں ہماری شریعت کی شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کو مانع تھیں اس لئے آپ نے فیصلہ فرمایا کہ سکھ قوم پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکامات شریعت کی حارج اور مانع تھی جہاد کیا جائے۔[۴]

مولانا خیر الدین نے سید صاحب کے سفر کی حیثیت سے سکھ لشکر کے عیسائی سربراہ جنرل انٹورا سے ملاقات کی۔ باہم گفت وشنید میں کئی مسائل زیر بحث آئے۔ ایک مسئلہ سکھوں سے جہاد کے متعلق بھی تھا۔ مولانا تھانیسری لکھتے ہیں۔

جنرل انٹورا صاحب: آپ کے نزدیک جیسے سکھ قوم کافر ہیں ویسے ہی ہم نصرانی بھی ہیں یا کچھ فرق ہے۔

مولوی خیر الدین نے فرمایا: ''کفر میں دونوں برابر ہیں''۔

انٹورا صاحب: ملک ہندوستان میں خلیفہ صاحب کے لاکھوں جانثار مرید بڑے بڑے زمیندار اور نواب ہیں اس وقت تمام ہندوستان نصرانیوں کے قبضہ میں ہیں۔ پھر جب نصرانی اور سکھ دونوں کفر میں برابر ہیں تو خلیفہ صاحب نے اپنے لاکھوں مریدوں کو جمع کر کے گھر بیٹھے بٹھائے انگریزی سرکار سے جہاد کیوں نہیں کیا؟ ناحق دور دراز سفر کی محنت و مشقت اٹھا کر یہاں سے سکھوں سے لڑنے کو آئے؟

مولوی خیر الدین صاحب نے فرمایا: ہم کو سرکار انگریزی کسی فرائض مذہبی کے ادا کرنے سے نہیں روکتی۔ ہر مذہبی امر میں ہم کو پوری آزادی دے رکھی ہے برخلاف سکھوں کے کہ انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو ذلیل کر کے بلند اواز سے اذان تک کہنا منع کر رکھا ہے۔ اگر کوئی مسلمان عید، بقرعید پر بھی گائے کی قربانی کرے تو خالصہ سرکار ان کو جان سے مار ڈالے۔ یہی سبب ہے کہ خلیفہ صاحب انگریزوں کو چھوڑ کر سکھوں سے جہاد کرنے کو آئے۔[۵]

مولوی خیر الدین کا یہ بیان اور جواب اس دور کا ہے جب سید صاحب سرحد میں قیام فرما تھے اور کتنا واضح بیان ہے کہ سید صاحب سکھوں سے جہاد کیلئے سرحد آئے۔ انگریز عادل حاکم ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا کھلی آزادی دے رکھی ہے لیکن نہ جانے آج لوگ کیوں سید صاحب کو انگریز دشمن سمجھتے ہیں حالانکہ سید صاحب سکھوں سے دشمنی اور عداوت رکھتے تھے۔ مولوی خیر الدین اور جنرل انٹورا کی ملاقات کی زیر بحث آنے والے اس مسئلہ کو مولانا ابوالحسن علی ندوی اور غلام رسول مہر غائب کر گئے۔ غالباً ان کی خودساختہ داستان متاثر ہو رہی تھی جو انہوں نے سید صاحب کے انتقال کے سوا سو سال بعد بڑی محنت اور

عرق ریزی سے مرتب کی ہے۔ سچ ہے۔

ع ؎ پیراں نمی پرند مریداں همی پرانند

سید صاحب کے خلیفہ ثانی شاہ اسمٰعیل دہلوی کا بیان سنیے۔

مولوی اسمعیل دہلوی نے یہ اعلان دے دیا تھا سرکار انگریزی پر نہ جہاد مذہبی طور پر واجب ہے نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے۔ ہم صرف سکھوں سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیتے ہیں۔[٦]

سید صاحب کو الہام ہوتا رہا کہ آپ سکھوں کے خلاف جہاد کریں سوا سو سال تک لوگ یہی کہتے رہے لیکن ایک سو پچیس سال بعد غلام رسول مہر کو الہام ہوا کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف تھے اور ان سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ انگریز کی مخالفت میں ان سے ایک حرف بھی منقول نہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمہ آفتاب را چہ گناہ

سید صاحب جب سکھوں سے جہاد کیلئے سرحد پہنچے تو علماء خوانین اور عوام نے دامے، قدمے اور سخنے امداد کی۔ کیونکہ سرحدی مسلمان بڑے جنگ جو تھے اور عرصہ سے سکھوں کے ساتھ معرکہ آرائیاں کر رہے تھے۔ سید صاحب بھی ان کی بولی بول رہے تھے اور زبان سے اللہ و رسول کا نام بھی لیتے تھے۔ اس لئے سرحدی مسلمانوں کی عقیدت ایک فطری تقاضا تھی۔ سید صاحب سے عقیدت کا بیان کرتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

(چارسدہ) میں سید صاحب اونٹ پر سوار تھے۔ اس پر جھالر والا زین پوس پڑا ہوا تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ زائرین پوش کے تار نکال نکال کر بطور تبرک لے گئے۔ بلکہ اونٹ کی دم کے بال بھی محفوظ نہ رہے۔ جنہیں ان تبرکات میں سے کوئی حصہ نہ مل

سکا وہ اونٹ کے نقش ہائے پا کی خاک اٹھا اٹھا کر سر اور آنکھوں پر ملتے رہے۔[۷]

سرحد کے سادہ لوح مسلمان کیسے سید صاحب کے گھیرے میں آئے۔ زین پوش کے تار کجا اونٹ کی دم کے بال اور اونٹ کے نقس پا کی خاک بطور تبرک محفوظ کر رہے ہیں اور جانثاری کیلئے ہر شخص دوسرے سے سبقت کی کوشش میں ہے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ اپنی موت کا ساماں خود کر رہے ہیں۔ اپنی ہی آستینوں میں سانپ پال رہے ہیں کہ

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود　　　گرچہ با مردم بزرگ شود

لیکن سرحدی مسلمان یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کر رہے تھے ان کے گلستان قلب میں ببول کے پیڑ نہ تھے ان کی لوح دماغ پر اسلام کا قدیمی نقشہ مرتسم تھا۔ وہ اپنے قدیم اسلامی عقائد پر مستحکم اور مضبوط تھے کسی جدید آئینہ کی احتیاج نہ رکھتے تھے۔

سید صاحب اپنے الہامی قول کے مطابق سکھوں سے جہاد کیلئے سرحد آئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ زبانی جمع خرچ تھا۔ انہوں نے سکھوں سے زیادہ جنگیں مسلمانوں سے کیں۔ ان میں مذہبی منافرت پیدا کی۔ اور بے شمار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا۔

پہلی شب خوں جو اکوڑہ میں ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوئی اور آخری معرکہ بالاکوٹ میں ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوا۔ اس ساڑھے چار سالہ درمیانی عرصہ میں سید صاحب نے کل چھوٹی بڑی ۱۵ جنگیں کیں جن میں خالص سکھوں سے صرف ۵ جنگیں ہوئیں۔ ان میں بھی جنگ صرف ایک ہوئی باقی چار شب خوں مارے گئے۔ ان پانچ معرکوں میں سے سید صاحب بذاتِ خود صرف جنگ شیدو میں شریک ہوئے۔ باقی چار کے قائد یہ تھے۔

(۱) اکوڑہ	اللہ بخش مورائیں	(۲) ڈمگلہ	شاہ اسمٰعیل دہلوی
۳) شنکیاری	شاہ اسمٰعیل دہلوی	۴) مظفر آباد	مولوی خیر الدین شیر کوٹی

بیچارے سرحدی مسلمانوں نے اسلام کے نام پر سید صاحب کا پورا پورا ساتھ دیا جنگ اکوڑہ میں کل نو سو افراد شریک تھے۔ جن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

''نوسو آدمیوں میں سے ایک سو چھتیس (136) ہندوستانی تھے۔ قریباً اسی قندھاری، باقی اہل سرحد تھے''۔[۸]

کیا اب بھی سرحدی مسلمانوں کی حمیت اسلامی میں کوئی شک ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اسلام کے نام پر اپنی اکثریت سید صاحب کے حضور پیش کر دی۔

لیکن غلام رسول مہر کا خمیر خدا معلوم کس خاک سے تیار ہوا ہے کہ وہ ہر موقع پر اخفاء حقائق اور اتہام بازی سے کام لیتے ہیں جہاں کامیابی ہوتی ہے تو اس کا سہرا ہندوستان کے وہابی سپاہیوں کے سر سجاتے ہیں اور ناکامی کی زنجیر بے چارے سرحدی مسلمانوں کے پیروں میں باندھتے ہیں۔ **اللھم ارنا الحق حقاً وارنا الباطل باطلاً**. اب اس اکلوتی جنگ کی بھی سنئے جس میں سید صاحب اپنے وجود عنصری کے ساتھ شریک ہوئے۔

جنگ شیدو: سرحدی مسلمانوں کی اسلامی دوستی اور سکھ دشمنی کی روشن مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں ایک لاکھ مسلمان سید صاحب کی قیادت میں جمع ہو گئے۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

دو مہینوں میں اسی (۸۰) ہزار سرحدی عوام جہاد کیلئے فراہم ہو گئے۔ سرداران پشاور کا لشکر اس سے الگ تھا۔ اس کی تعداد بیس ہزار بتائی جاتی تھی۔[۹]

اتنی بڑی تعداد کیوں اور کیسے جمع ہوئی۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

اسی (۸۰) ہزار کی فراہمی میں سب سے بڑا حصہ فتح خان پنجتاری اشرف خان اور خادی خان کا تھا۔[۱۰]

گویا سرحدی مسلمان سکھوں سے جہاد کے جذبہ سے سرشار تھے اور ان تین سرداروں کی آواز سنتے ہی مستعد ہو گئے۔ دو ماہ کی قلیل مدت میں ایک لاکھ سرحدی مسلمانوں کا جمع ہونا غیر معمولی بات تھی۔ موضع شیدو میں دونوں لشکر جمع ہوئے۔ سکھ لشکر کے بارے میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

سکھ فوج تیس پینتیس ہزار سے کم نہ تھی۔[۱۱]

یعنی سکھ لشکر کے تیسرے حصے سے بھی کم تھا۔ جنگ شروع ہوئی۔ سید صاحب فیل پر سوار لشکر کے عقب میں تھے۔[۱۲] بڑے زور کی جنگ ہوئی۔ قیادت کی عاقبت نااندیشی کور چشمی اور نا اہلی کی وجہ سے مسلمانوں کو شرمناک شکست ہوئی۔ ۳۵/۳۰ ہزار سکھوں کے مقابلے سے ایک لاکھ اصحاب فیل میدان جنگ سے ایسے بھاگے کہ ایک دوسرے کو روندے چلے جا رہے تھے۔ سید صاحب کے ہاتھی کو تیز بھگانے کی کوشش کی گئی لیکن اس کی سست رفتاری کے باعث سید صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگے (یا بھگائے گئے)[۱۳] اس طرح تمام لشکر تتر بتر ہو گیا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

ہندوستانی غازی بھی مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ چند آدمی سید صاحب کیساتھ تھے۔ ایک جماعت مولانا شاہ اسمٰعیل کی معیت میں تھی۔ ایک گروہ اکوڑا پہنچ گیا۔[۱۴]

یعنی سید صاحب اور آپ کے رفقاء سکھوں سے ایسے ہراساں ہوئے کہ ہر ایک ''خوفِ جاں'' سے بھاگ رہا تھا۔ اسے دوسروں کا خیال نہ تھا۔ خود شاہ اسمٰعیل

اپنے پیر طریقت کو چھوڑ کر پشاور کی طرف نکل گئے۔ غالباً سب سے زیادہ ہراساں خود سید صاحب تھے۔

میدان جنگ سے تیز رفتار گھوڑے پر دریا کو عبور کرنے (موضع) سر پہنچے۔ وہاں سے ناکامی کے بعد دریائے ناگماں اور دریائے سوات کے سنگھم پر پہنچے۔ جلدی میں گھوڑے سے دریا میں گر گئے۔ دریا پار کر کے بھابڑہ گئے وہاں سے ڈاگئی، گوجر گڑھی، محبّ سرخ ڈھیری، اور باغ کے راستے چنگلئ پہنچے۔ چنگلئ ایک محفوظ ترین مقام تھا۔ سید صاحب نے سکھوں کے خوف سے بڑے سرعت سے تقریباً کئی میل سفر کے بعد قیام کیا۔ یہ تھی جنگ شیدو کی داستان جو بڑی رنگ آمیزی سے بیان کی جاتی ہے۔ اگر یہ واقعی جہاد تھا تو میدان جہاد سے فرار ہونے والوں کے بارے میں قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

مہر صاحب نے اس موقع پر بھی شکست کا باعث سرحدی مسلمانوں کو قرار دیا اور وہابی سپاہیوں کی چادر کو سفید ہی رہنے دیا۔

---

۱ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوب احمدی ص ۲۳۶

۲ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوب احمدی ص ۱۸۰

۳ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۱۷۲

۴ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۱۲۵

۵ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۲۶۱

۶ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۳۲

۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۲۵

۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۳۴

۹ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۶۵

۱۰ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۶۵

۱۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۶۶

۱۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۷۸

۱۳ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۷۹

۱۴ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۷۹

امیر المؤمنین بننے کا قصہ

جنگ شیدو میں شکست کے بعد مجاہدین میں نظم ونسق پیدا کرنے کے لئے ۱۲ جمادی الاُخریٰ ۱۲۴۲ھ کو ہنڈ میں ہندوستانی مجاہدین، علماء اور خوانین کا اجتماع ہوا جس میں مسلمانوں سے ایک امیر کی قیادت میں جمع ہونے کی درخواست کی گئی۔

یہ درخواست کنندہ معلوم نہیں ہندوستانی مجاہدین میں سے کوئی تھا یا سرحدی مسلمانوں میں سے۔ اگرچہ گمانِ غالب شاہ اسمٰعیل کی طرف ہے۔ تاہم اس اجتماع میں سید صاحب کو ''امیر المؤمنین'' کا لقب دے دیا گیا۔

سید صاحب امیر المؤمنین تو ہو گئے لیکن ان کی امارت ایسی نہ تھی جیسے اسلامی حکومت میں مسلمان حاکم کی ہونی چاہئے۔ بلکہ سید صاحب صرف ''جنگی تیاری'' کے امیر تھے۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ امامت کے بعد سید صاحب کو صرف کاروبار جہاد کی تنظیم کیلئے مختار بنایا گیا تھا۔ رؤسا و خوانین کے عام امور ریاست وخانیت سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ دعوت کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں جہاد کے جذبے کو ابھار سکتے تھے۔ انہیں دینی واجبات سمجھا سکتے تھے۔ جن جن رئیسوں نے بیعت کی تھی ضرورت کے مطابق ان سے امداد طلب فرما سکتے تھے۔ میدان جنگ میں سب لوگ ان کی تنظیمات قبول کرنے پر مجبور تھے لیکن میدان جنگ سے باہر آتے ہی سب اپنے حلقوں میں بالکل آزاد تھے۔ موجودہ زمانے کی عام اصطلاح میں یوں سمجھ لینا چاہیے کہ جہاد کی غرض سے تمام عناصر کو یکجا رکھنے کے لئے یہ ایک نوع کی کنفڈریشی (یعنی عوام وخوانین رؤسا کا وفاق واتحاد) بن گئی تھی۔ جس

کے رئیس اعلیٰ سید صاحب تھے۔[۱]

جب سید صاحب کے اختیارات اتنے کم اور محدود تھے تو اس کیلئے ''امیر المؤمنین'' کے بجائے ''امیر الحرب'' کا لقب دیا ہوتا۔ اختیار میں کمی اور لقب میں اتنی وسعت معنی خیز ہے۔ امیر المؤمنین کے لقب کا پس منظر معلوم کرنے کے بعد ایک توڑ جوڑ سے ناواقف مسلمان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ جناب مہر صاحب لکھتے ہیں۔

ہندوستانی غازی پہلے سے آپ کو ''امیر المؤمنین'' کہتے تھے۔ اہل سرحد نے آپ کو ''سید بادشاہ'' کا لقب دے دیا۔ سکھ.......... آپ کے لئے خلیفہ کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔[۲]

ہندوستانی غازی سید صاحب کو امیر المؤمنین کیوں کہتے تھے۔ سید صاحب اس وقت مسلمانوں کے کس علاقے کے امیر تھے۔ یہ ایسے سوال ہیں جن کا کوئی جواب نہیں تاہم شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب کو لفظی امیر المؤمنین تو بہت سے پہلے ہے بنا دیا تھا اب باقاعدہ امیر المؤمنین بنانے کی تگ ودو میں لگے ہوئے تھے اور یہ اجتماع اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

دوسرا اجتماع: جب سید صاحب میں سکھوں سے تاب جنگ نہ رہی تو مسلمانوں کی طرف رخ موڑا اور اپنے اس مشن اور مقصد میں تبدیلی کر لی جو ہندوستان سے لے کر چلے تھے۔

آپ نے فرمایا کہ جہاد اسی صورت میں تائید آسمانی کے نزول کا باعث بن سکتا ہے کہ سب لوگ حقیقی معنی میں مسلمان بن جائیں جو کچھ کریں خدا کی رضا کیلئے کریں۔ اسی صورت میں اطاعتِ امام کی حقیقت سے وہ آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اسی

صورت میں بدعات و منکرات اور معصیت امام سے پاک ہو کر خدا اور رسول اور اولی الامر کی فرمانبرداری کا حق ادا کر سکتے ہیں۔[۳]

اب سکھوں کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کو مسلمان بنانے (یا کافر بنانے) کی تحریک شروع ہوئی۔ یہیں سے تفریق بین المسلمین کی ابتداء ہوئی۔ مسلمان سنی و وہابی کے دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور ملت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ سید صاحب کے متبعین جنہیں ''وہابی'' کہا جاتا ہے آج ڈیڑھ سو سال بعد بھی سنی مسلمانوں کو (کافر و مشرک تصور کرتے ہوئے) مشرف باسلام کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

کاش کہ وہ خود کی اصلاح کے بعد کافروں کو مسلمان کرنے میں اپنی قوت صرف کرتے۔ چنانچہ تحریک امارت کو روبہ عمل لانے کیلئے یکم شعبان ۱۲۴۴ھ کو پنجتار میں دوسرا اجتماع ہوا جس میں سید صاحب سے ذہنی وابستگی رکھنے والے علماء اور خوانین شریک ہوئے۔ شاہ اسمعیل کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور اجتماع میں موجود لوگوں نے سید صاحب سے اقامت شریعت کی بیعت کر لی۔ بیعت ثانی کے بعد سید صاحب کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ آیا بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب کے اختیارات فرماں روائی میں کوئی اضافہ ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بیعت، امامت نے سید صاحب کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ بیعت اقامت شریعت کی رو سے وہ احکام شرعی کا مرکز بن گئے۔[۴]

یعنی اب بھی سید صاحب کو کلی اختیارات نہ تھے۔ ہر رئیس اور سردار اپنے علاقہ کا حاکم تھا۔ سید صاحب شرعی معاملات میں دخیل ہوئے اور اپنے ہمنوا رئیسوں کے علاقے کو اسلامی حکومت کا رقبہ قرار دے دیا۔ حالانکہ سید صاحب کو زیادہ سے زیادہ ایک قاضی القضاء کے

اختیارات حاصل تھے۔ایسے میں آپ کو"امیر المؤ منین" کا لقب دینا یا تو مزاح ہے یا خوش عقیدگی۔بہر کیف سید صاحب کے قلمی جانثاروں نے اسے اسلامی حکومت کا نام دے دیا۔

[1] غلام رسول مہر۔سید احمد شہید ص ۳۵۴ [2] غلام رسول مہر۔سید احمد شہید ص ۳۵۳

[3] غلام رسول مہر۔سید احمد شہید ص ۴۵۹ [4] غلام رسول مہر۔سید احمد شہید ص ۴۴۶

امیر المؤ منین کا منکر باغی ہے

شاہ اسمٰعیل یہ بات جانتے تھے کہ سرحدی مسلمان اعتقادی اختلاف کی بنیاد پر ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔اس لئے پیش بندی کرتے ہوئے انہوں نے اجتماع پنجتار میں موجود علماء سے قبل از وقت یہ فتویٰ لے لیا۔

(۱) اثبات امامت کے بعد حکم امام سے سرتابی سخت گناہ اور قبیح جرم ہے۔
(۲) مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کیلئے تلواریں نکال لیں اور امام کا حکم بزور مخالفوں پر نافذ کریں۔
(۳) اس معرکہ میں لشکر امام سے جو شخص قتل ہوگا وہ شہید و نجات یافتہ سمجھا جائے گا اور لشکر مخالف کے مقتولین مردود و ناری متصور ہوں گے۔ان کی حالت اکثر فاسقوں مثلاً زانیوں اور سارقوں سے بھی بدتر ہوگی۔اس لئے کہ فاسقون کے جنازے کی نماز واجب ہے لیکن ان مخالفوں کے جنازے کی نماز بھی جائز نہیں۔[1]

اگر کوئی شخص سید صاحب کی مخالفت کرتا ہے ان کی خود ساختہ اسلامی حکومت پر تنقید کرتا ہے ان کے قاضیوں کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے تلوار اٹھاتا ہے۔ اب اگر وہ اس وقت مر جاتا ہی تو اس کی نماز جنازہ بھی جائز نہیں اور وہ عنداللہ مردود

وناری ہوگا۔ سید صاحب کا حامی قتل ہو جائے تو وہ شہید تصور ہوگا اور عند اللہ نجات یافتہ ہوگا۔ سید صاحب نے امیر المؤمنین کے مرتبے پر فائز ہونے کے بعد لوگوں کو متعدد خطوط لکھے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

وہ شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ جو میرے اس منصب (امیر المؤمنین) کا اقرار کرتا ہے اور جو میرے منصب کا انکار کرتا ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں مردود ہے۔[۲]

سید صاحب امیر المؤمنین کیا ہوئے کہ حق و باطل، جنتی و جہنمی اور مقبول و مردود ہونے کے پیمانے اور اصول بدل گئے اور تحریک وہابیت کی مخالف سرحد کے مسلمان علماء خوانین اور عوام یقیناً مردود ہو گئے۔ اور مردود بھی سید صاحب کی بارگاہ سے نہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالغفور اخوند سواتی اور حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی جن کے علم و فضل اور زہد و اتقاء کی حکایتیں اور داستانیں ارض عالم میں مشہور ہیں اور ایک عالم ان سے فیضیاب ہے۔ انہیں بارگاہ الٰہی کا مردود سمجھنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

کاش کہ سید صاحب ایسے پاکیزہ لوگوں کو مردود کہنے کے بجائے اپنے نفس امارہ کی اصلاح کر لیتے۔

جب سید صاحب امیر المؤمنین ہو گئے تو لوگوں کو آپ کی بیعت پر آمادہ کرنے کی کوششیں ہونے لگیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ منشی محمد حسین بجنوری لکھتے ہیں۔

جب کوئی امیر مسلمان اور عالم پنجاب کا ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ جب انہوں نے ان کی تکفیر کا فتویٰ جاری کیا۔ اس فتویٰ تکفیر کے اجراء سے تمام ملک پنجاب کے

امیر اور علماء ناراض ہو گئے اور جواب لکھے کہ تم وہابی مذہب ہو تم سے بیعت کرنا روا نہیں۔[۳] سید صاحب کی بیعت نہ کرنے والے مسلمانوں کو کافر، منافق، باغی ایسے سے بیشمار خطاب ملے۔ چنانچہ مولوی قطب الدین ننگر ہاروی اسمٰعیل زئی اور دولت زئی قبیلوں میں گئے اور ان سے کہا۔

تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو حالانکہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جو شخص بیعت امامت کے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا اور امام (سید احمد) تمہارے درمیان موجود ہے۔[۴] کس علاقے پر سید صاحب کی حکومت تھی جہاں انہوں نے اسلامی قوانین نافذ کر رکھے تھے۔ آخر سید صاحب کی بیعت پر کون سی نص قرآنی وارد ہے جس کے انکار سے ایک ایسا مسلمان کافر ہو جائے جو کلمہ و نماز پڑھتا ہے۔ زکوٰۃ و حج کرتا ہے رمضان کے روزے رکھتا ہے۔ لوگوں کو ارکان اسلام کے ادا کرنے کی تبلیغ کرتا ہے اگر امیر المؤمنین بننے کا یہی طریقہ ہے تو ہر حاکم کو یہ اختیار ملنا چاہئے کہ جو اس کی بیعت نہ کرے۔ اسے امیر المؤمنین تسلیم نہ کرے وہ اسے کافر قرار دے کر دنیا سے رخصت کرنے کی شرعی سند حاصل کر لے۔

اہل خیبر منافق و باغی ہیں:

سرحد کے مسلمان درّانی سرداروں سے سید صاحب کی مخالفت ہوئی اور نوبت جنگ تک پہنچ گئی تو سید صاحب نے مجاہدین کا ایک گروہ اہل خیبر (سرحد) کے پاس حصول امداد کے لئے بھیجا جس کے امیر سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی تھے۔ اور ساتھ ہی سید صاحب نے ایک اعلام نامہ بھی تیار کر کے دیا جس کے مضمون کے بارے میں مہر صاحب لکھتے ہیں۔

مجاہدین کی اعانت و رفاقت ایمان و انقیاد کی علامت ہے ان سے الگ رہنا نفاق

وفساد کا نشان ہے۔بغی وطغیان کا دائرہ اتنا پھیل چکا ہے کہ انہیں ختم کیے بغیر جہاد ممکن نہیں رہا۔لہذا منافقوں کے مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اسے جہاد کا اعلیٰ مرتبہ سمجھو۔[۵]

یعنی درانی سرداروں کے اکثر مسلمان منافق و باغی ہیں۔ان کے خلاف آپ ہماری حمایت کریں اور مسلمانوں کے ساتھ اس جنگ کو جہاد کا اعلیٰ مرتبہ سمجھیں اب اہل خیبر کا جواب ملاحظہ کریں اور سوچیں کہ سرحد میں سید صاحب کے علاوہ کوئی اور مسلمان تھا۔

مولوی نصیر الدین منگلوی، ارباب بہرام خان اور سید احمد علی کی طرف سے یہ پیغام لائے کہ ابتدا میں سمت ''خیبر'' کے قبائل مجاہدین کی اعانت پر متفق ہو گئے تھے پھر ان میں تفرقہ پڑ گیا اور وہ درانیوں کے طرف دار بن گئے۔[٦]

درّانی اور دوسرے سرحدی مسلمان پہلے ہی سے منافق و باغی کا خطاب پا چکے تھے۔اب اہل خیبر سید صاحب کی اعانت نہ کر کے منافق و باغی ہو گئے۔ کیونکہ سید صاحب تحریر فرما چکے تھے کہ مجاہدین سے الگ رہنا منافقت کا نشان ہے۔

سردار پائندہ خان پر فتویٰ کفر:

سردار پائندہ خان جو ہزارہ کا بڑا بارعب سردار تھا جس کے بارے میں مہر صاحب لکھتے ہیں۔

خان یقیناً بہادر، بلند ہمت اور با تدبیر رئیس تھا۔اس کی شجاعت و اولوالعزمی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ سب سردار سکھوں سے دب گئے۔لیکن وہ ہزار مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود بدستور مقابلے پر جما رہا۔[۷]

اتنے اوصاف کے باوجود جب پائندہ خان نے سید صاحب کی بیعت سے

انکار کیا تو فتویٰ کفر کا مستحق ٹھہرا۔ سید مراد علی لکھتے ہیں۔

سردار پائندہ خان نے خلیفہ کی بیعت نہ کی۔ لہذا خلیفہ جانب پائندہ خان سے بدگمان تھا۔[۸]

اب اس بدگمانی کا نتیجہ کیا نکلا مراد علی لکھتے ہیں۔

خلیفہ نے نسبت پائندہ خان فتویٰ کفر کا دے کر معہ مولوی اسمعیل ولشکر غازیان برہمونی سر بلند خان و مدد خان عزم جنگ پائندہ خان پر مستعد ہوا۔[۹]

سردار خادی خان پر فتویٰ منافقت:

اسی طرح خادی خان ابتدا میں سید صاحب کا ہمنوا تھا۔ جناب مہر لکھتے ہیں۔

خادی خان علاقہ سرحد کا غیور و جسور رئیس تھا۔ سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت میں سبقت کا شرف حاصل کیا۔ آپ کو مہمان بنا کر اپنے ہاں لے گیا اور وہیں امامت جہاد کی بیعت کی۔[۱۰]

جب یہی خادی خان وہابی عقائد کے پرچار کی وجہ سے سید صاحب کا مخالف ہوا تو سنیئے مہر صاحب کیا فرماتے ہیں۔

خادی خان کی طبیعت ضدی اور خود پسند تھی۔ افغانی مراسم کو وہ اسلامی مراسم پر ترجیح دیتا تھا۔[۱۱]

جب خادی خان نے وہابی مجاہدین سے جنگ کی اور قتل ہو گیا تو سید صاحب کے ایک معتقد مولوی جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

''یہ (خادی خان) منافق بھی مسلمانوں کو گولی سے ختم ہو گیا''۔

مولانا شاہ اسمٰعیل نے اس منافق کے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کیا مگر ملکی ملاؤں نے بہ طمع دنیا بوقت شب اس پر نماز پڑھ کر چپکے سے اس کو دفن کر دیا۔ [۱۲] سردار پائندہ خان اور خادی خان میں عیب یہ تھا کہ وہ سید صاحب کے مرید نہ ہوئے بلکہ وہابی عقائد کی وجہ سے مخالفت کی وجہ سے کافرومنافق کا خطاب پایا اسلام پر افغانیت کی ترجیح کا طعنہ ملا۔ اوران علماء کرام کو طمع دنیا کی گالی ملی جنہوں نے شہید مذہب سنی حنفی کی نماز پڑھی۔

ا غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۶۳
۲ محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوب احمدی ص ۲۴۱
۳ منشی محمد حسین محمود۔ فریاد مسلمین ص ۹۸
۴ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۰۳
۵ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۵۰
۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۵۴
۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۴۱
۸ سید مراد علی علیگڑھ۔ تاریخ تناولیاں ص ۴۹
۹ سید مراد علی علیگڑھ۔ تاریخ تناولیاں ص ۵۰
۱۰ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۸۷
۱۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۷۸
۱۲ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۲۴۳

اسلامی حکومت کا پہلا باغی

مولوی محبوب علی دہلوی سید صاحب کے معتقد خاص تھے۔ سید صاحب کی ہندوستان سے آمد کے بعد مسلمانوں میں جہاد کی تبلیغ کرتے رہے جو لوگ ہاتھ آ گئے انہیں لے کر سید صاحب کی خدمت میں پنجتار پہنچے۔ یہاں انہیں وہ جہاد نظر نہ آیا جو سید صاحب کے مکاتیب میں تحریر ہوتا تھا۔ مجاہدین کی کیفیت اور حالت بھی اسلامی نقطہ نگاہ سے ٹھیک معلوم نہ ہوئی۔ پہلے تو سید صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور مندرجہ ذیل سوال اٹھائے۔

۱۔ آپ کا امیر المؤمنین ہونا شرعی نقطہ نگاہ سے درست نہیں۔

۲۔ آپ کا باورچی خانہ الگ ہے۔ آپ مجاہدین سے عمدہ کھانے کھاتے ہیں جبکہ مجاہدین بے چارے چکی چلاتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں اور انہیں پاؤ پاؤ غلہ ملتا ہے۔

۳۔ آپ کا لباس عمدہ اور نفیس پہنتے ہیں۔ جو مجاہدین کو میسر نہیں ہوتا۔

سید صاحب نے فرمایا کہ ”اگر میری امارت صحیح نہیں تو آپ امیر المؤمنین ہو جایئے۔

دوسرے سوال کا جواب سید صاحب کی طرف سے مولانا ابوالحسن علی ندوی دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سید صاحب کے یہاں یہ طرز تھا کہ اس ملک کے جو لوگ آپ کی ملاقات کو آتے تھے وہ تحفہ کے طور پر کوئی دو مرغ لاتے، کوئی سیر دو سیر شہد یا گھی لاتے، کوئی چاول، کوئی مرغی کے انڈے لاتے، آپ یہ تمام چیزیں بحفاظت تمام اپنے باورچی خانے میں رکھوا دیتے۔ اور اگر کوئی مہمان بے وقت آ جاتے تو آپ اسی تحفے اور سوغات میں سے جو مرغ، چاول، انڈے وغیرہ ہوتے ان کے لئے کھانا پکواتے اور ان کو کھلاتے اور ان کے شریک ہو کر آپ بھی کھا لیتے۔[۱]

مولانا ندوی نے مرغ، شہد اور انڈوں وغیرہ میں سید صاحب کی شمولیت ذیلی اور ثانوی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم مولوی محبوب علی دہلوی کا اعتراض بے محل اور بے وقعت نہ تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب بڑے صاف گو آدمی تھے۔ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتے اسے بلا روک ٹوک نوک زبان پر لے آتے۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض درست اور نا قابل تاویل ہے۔ اس کی حقیقت ندوی صاحب نے بھی تسلیم کی ہے۔

تیسرے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔
یہ اعتراضات بے جا تھے۔ اس لئے سب کو معلوم تھا سید صاحب وہی معمولی لباس پہنتے ہیں۔ [۲]

مولوی محبوب علی کوئی نابینا نہ تھے۔ ان کی دو آنکھیں تھیں۔ وہ دونوں آنکھوں سے دیکھتے تھے اور سید صاحب بھی ان کے سامنے رہتے تھے۔ بلکہ رہائشی خیمے بھی قریب قریب تھے اور مہر صاحب اُن کے انتقال کے مدت بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے مہر صاحب کو ''امیر پرستی'' میں تدبیر سے کام لینا چاہیے۔ تاہم مہر صاحب کی ''بے جا'' کی تاویل بے جا پر ہم ان کے پیش رو مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اقتباس پیش کرتے ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

دوسرا اعتراض مولوی (محبوب علی) صاحب کا پوشاک ....وغیرہ پر تھا۔
اس کا حال یہ ہے کہ شیخ غلام علی صاحب الہ آبادی سلے ہوئے کپڑے کے گٹھے خاص آپ کی ذات کے لئے بھیجتے رہتے تھے اور جوتوں کے جوڑے بھی وہیں سے آتے تھے۔ اسی طرح مریدین کے یہاں سے ہر قسم کے تھان اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں روپے خاص آپ کے خرچ کے واسطے آتے تھے۔ یہ روپیہ آپ اپنی مرضی کے موافق جہاں مناسب سمجھتے صرف کرتے۔ [۳]

مولانا ندوی کے اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ سید صاحب عمدہ اور نفیس لباس پہنتے تھے اور مولانا ندوی نے بھی اس سے انکارنہیں کیا بلکہ تاویل کی کہ وہ لباس مریدین بطور نذرانہ پیش کرتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی محشی اور مصدقہ کتاب ''ارواح ثلاثہ'' میں سید صاحب کا بیان امرقوم ہے کہ

''میں ہرروز جوڑا بدلتا ہوں''۔[۴]

سید صاحب اپنی اعلیٰ خوش پوشی کا ذکر خود فرمارہے ہیں اور مہر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اعتراضات بے جا ہیں اس لئے کہ سب کو معلوم ہے کہ سید صاحب وہی معمولی لباس پہنتے ہیں۔اب مہر صاحب دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں ورنہ ہم ان سے یہ ضرور عرض کرتے کہ دروغ نویسی مسلمان کو زیب نہیں دیتی۔

مجاہدین سے: مولوی محبوب علی دہلوی نے سید صاحب کے علاوہ مجاہدین کو بھی مخاطب بنایا اوران سے بھی کہا کہ جو کچھ تم کررہے ہو یہ جہاد نہیں۔اس لئے اپنے گھروں کو جاؤ مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے مجاہدین سے کہا۔

''تمہارے اوپر بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق ہیں۔تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔لوگوں نے کہا کہ جہاد کے واسطے۔مولوی صاحب نے کہا۔جہاد کہاں ہے اور کون سے کفار سے تمہارا مقابلہ ہے۔کس ملک میں تمہارا عمل دخل ہوا۔صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو۔جہاد کا محض بہانہ ہے۔تمہاری دنیا وآخرت دونوں خراب ہیں''۔[۵]

''جہاد کا محض بہانہ ہے تمہاری دنیا وآخرت دونوں خراب ہیں'' یہ الفاظ شاہ مخصوص دہلوی اور شاہ محمد موسیٰ دہلوی کے کسی مرید یا شاگرد کے نہیں۔حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور سید صاحب کے معتقد کے ہیں جو تمام

حالات کو اپنی چشم سر سے دیکھ رہے تھے۔

جہاد کے حقیقی مفہوم سے فرار: مجاہدین پر مولوی صاحب کی باتوں کا اثر ہونے لگا۔ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگی اور مجاہدین دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ سید صاحب نے مولوی صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب علومِ اسلامیہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے اس لئے سید صاحب کی نصیحت آمیز باتوں کو سمجھ نہ سکے۔ ایک روز ہمت کر کے مولوی محمد حسن رامپوری نے آپ سے مسئلہ جہاد میں مندرجہ ذیل گفتگو کی۔

مولوی محمد حسن رامپوری:۔ آپ کس دلیل سے غازیوں کے قیام کو لغو ٹھہراتے ہیں۔

مولوی محبوب علی دہلوی:۔ آپ یہاں کون سا جہاد کا کام کر رہے ہیں اور کن کافروں سے آپ کو جہاد درپیش ہے۔

مولوی محمد حسن رامپوری:۔ جنگ کا نام ہی جہاد نہیں ہے۔ جنگ کو قتال کہتے ہیں اور وہ کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ جہاد کے معنی ہیں اعلاء کلمۃ اللہ اور یہاں لوگ اس کام میں مصروف ہیں۔ آپ ان کے فعل کو عبث قرار دے رہے ہیں۔ اگر کسی روز کفار سے مقاتلہ پیش آجائے اور آپ دہلی میں ہوں تو کون سی کرامت سے آپ یہاں پہنچیں گے۔

اس کے بعد جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

مولوی صاحب یہ (جواب) سن کر لاجواب ہو گئے۔[٦]

مولوی محمد حسن کی اتنی سی گفتگو کے بعد مولوی محبوب علی لاجواب ہو گئے (یا مہر صاحب نے انہیں لاجواب کر دیا) بہر کیف مولوی محبوب علی دہلوی کی شکست نہ سمجھ میں آنے والی چیز ہے۔ ان کے اعتراض مشاہدہ کے بعد معرضِ وجود میں آئے اور حقائق پر مبنی تھے۔ ان کا جواب نہ سید صاحب سے بن رہا تھا اور نہ سید صاحب کے

حوارین سے۔مولوی محمد حسن کا جہاد کے معنی میں وسعت پیدا کر کے اپنی خامیوں کو اس میں لپیٹنا اور چھپانا کوئی ایسا عقدہ نہ تھا جس کے جواب سے مولوی محبوب علی عاجز ہو گئے۔اب چونکہ کاروائی لکھنے والے سب سید صاحب کے حمایتی اور جانثار تھے اس لئے حقائق مخفی ہو گئے۔ورنہ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بحث ومباحثہ کے بعد مولوی محبوب علی کو کوئی مسکت جواب نہ دے سکا۔اس لئے وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دہلی واپس ہو گئے اور ساری عمر سید صاحب کے اس جہاد کی مخالفت کرتے رہے۔ان کی واپسی کے واقعہ کو سید صاحب کے متعلقین نے فرار کا نام دیا اور ساتھ ہی یہ تاثر بھی دیتے ہیں کہ وہ شاہ اسمٰعیل کی ہزارہ سے آمد سے پہلے اس لئے راتوں رات بھاگ گئے کہ شاہ اسمٰعیل سے مسئلہ جہاد میں بحث کرنے سے گبھراتے تھے۔ہم یہی عرض کر سکتے ہیں۔

چوں قلم دردست غدارے بود لاجرم منصور بردارے بود

ورنہ مولوی محبوب علی ایک عالم تھے۔دہلی سے سرحد سکھوں سے جہاد کرنے آئے تھے اور مجاہدین پر ان کا اعتراض یہ نہ تھا کہ آپ جہاد کیوں کرتے ہیں بلکہ اعتراض یہ تھا کہ جہاد کیوں نہیں کرتے اور تمہارے امیر المؤمنین تن آسانی کا شکار ہو چکے ہیں اس صورت میں جبکہ کافروں سے جہاد نہیں کر رہے ہو تو یہاں بیٹھنا بیکار ہے۔اپنے گھروں کو جاؤ۔مولوی محبوب علی کی اس صاف کی بات کو سید صاحب کے قلمی جانثاروں نے اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ مولوی صاحب کے مذہب میں شک ہونے لگتا ہے۔حالانکہ وہ سید صاحب کے ہم عقیدہ اور ہم مشرب تھے۔

مولوی محبوب علی کی اس صاف گوئی اور غلط باتوں کی نشاندہی پر سید صاحب کے قلمی معتقدین نے ان کو تنقید بے جا کا نشانہ بنایا۔چنانچہ مولانا تھانیسری لکھتے ہیں۔

"انہوں نے نفس اور شیطان کی نیابت اختیار کی۔نفس امارہ اور شیطان نے ان کو دل برداشتہ کر رکھا تھا۔دہلی کے پلاؤ قورمہ پر ہاتھ مارنے کو ہندوستان واپس ہو گئے۔[7]

جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

''وہ تنگ مزاج بزرگ تھے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ (انہیں) شاہ جہاں آباد (دہلی) کے تر لقمے یاد آتے ہیں۔[۸]

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

وہ خود پسند تھا۔ خر دماغ تھا۔ متعصب اور کوتاہ اندیش تھا۔ حاسد اور مسلمانوں کو برباد کرنے والا تھا۔[۹]

مولوی محبوب علی کے اعتراضات سے سید صاحب کی اسلامی حکومت کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔ سید صاحب اور مجاہدین میں سلطان اور رعیت کا فرق بھی معلوم ہوگیا۔ ظاہر بات ہے ایسی حکومت کا اسلامی حکومت سے کیا علاقہ اور نسبت ہوسکتی ہے جس کی بنیاد حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا نے مدینہ منورہ میں رکھی اور جس کے امیر المؤمنین خلفاء راشدین رہے ہیں۔

---

۱ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۵۴

۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۳۳

۳ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۵۵

۴ مولانا اشرف علی تھانوی۔ ارواح ثلاثہ ص ۱۴۲

۵ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۶۵

۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۳۴

۷ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۲۳۶

۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۳۴

۹ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۵۷

اعتقادی اختلاف

سرحدی مسلمان سید صاحب کے ہم عقیدہ وہم مشرب نہ تھے اور نہ ہی سید صاحب کے مخصوص عقائد سے باخبر تھے۔ وہ سید صاحب کو اپنی طرح کا سنی حنفی مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شروع میں انہوں نے سید صاحب کی پرزور حمایت کی اور جان ومال کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔لیکن سید صاحب اور آپ کے رفقاء نے سرحدی مسلمانوں کی فداکاری اور جانثاری سے یہ غلط اندازہ لگایا کہ شاید وہ ہمارے ہم عقیدہ وہم خیال ہو چکے ہیں جونہی سید صاحب اور آپ کے رفقاء کی مخصوص اعتقادی سرگرمیاں شروع ہوئیں سرحدی مسلمان ایک ایک کر کے الگ ہونے لگے۔ چونکہ سید صاحب بعض دوسرے مجاہدین سے قدرے مصلحت پسند تھے۔اس لئے فی الوقت اعتقادی نزاع نہیں اٹھانا چاہتے تھے مگر شاہ اسمٰعیل اور ان کی جماعت نے مصلحت وقت کو پس پشت ڈالتے ہوئے مخصوص عقائد کو سکھوں سے جہاد پر اولیت دے دی اور آگے چل کر جہاد کا رخ بھی سکھوں سے مسلمانوں کی طرف ہو گیا۔نتیجتاً جانبین سے بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔سید صاحب نے جو حکومت قائم کی (اور بقول ان کے وہ اسلامی تھی) اس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ اور اہم وجہ یہی اعتقادی اختلاف تھا۔

حضرت مولانا شیخ اخوند سواتی درانی سرداروں کے پیر طریقت تھے۔شروع میں آپ بھی سید صاحب کے ہم نوا تھے۔لیکن مجاہدین کی وہابیانہ سرگرمیوں سے متنفر ہوئے اور وہابی مجاہدین کے خلافف تضلیل کا فتویٰ دیا۔ آپ کے ہمنوا علماء میں حضرت مولانا میاں نصیر احمد المعروف قصہ خوانی ملا، حضرت مولانا حافظ دراز پشاوری شارح بخاری اور ملا عظیم اخوندزادہ وغیرہ سرفہرست تھے۔ان علماء کرام کے فتویٰ کے

علاوہ ہندوستان سے بھی ایک فتویٰ آیا تھا جو سلطان محمد خان رئیس پشاور کے پاس موجود تھا جس کے بارے میں جناب مہر لکھتے ہیں۔

''اس ملاقات میں سلطان محمد خان نے ایک فتویٰ یا محضر خریطے سے نکال کر سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر بہت سی مہریں ثبت تھیں۔ محضر میں خوانین سمہ سے خطاب تھا۔ مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر تھوڑی سے جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہی لیکن یہ ان کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے خلاف ہیں۔ ایک نیا دین انہوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے سب کو برا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ ان کی باتوں میں نہ آنا عجب نہیں تمہارا ملک چھنوادیں۔ جس طرح بھی ہو سکے انہیں تباہ کر دو اگر اس باب میں غفلت اور سستی برتی تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے''۔[1]

جناب مہر نے فتویٰ پر مواہیر کا ذکر تو کیا لیکن ان علماء کرام کے اسماء کی وضاحت کو غائب کر گئے جو فتویٰ کے پس منظر کو سمجھنے کیلئے نہایت ضروری تھی اور ساتھ ہی یہ بات کہ ''یہ رنجیت سنگھ ہی کا کام ہو سکتا ہے'' کہہ کر فتویٰ کا رخ موڑنے اور حقائق کو چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن مہر صاحب کی ایک دوسری تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ ہندوستان سے آیا تھا۔ جب سرحدی مسلمانوں نے سید صاحب کے سپاہیوں کا قتل عام کیا تو سید صاحب نے بعض افراد کو اس کی علت معلوم کرنے بھیجا۔ سرحدی مسلمانوں نے جو کچھ کہا اسے مہر صاحب اس طرح لکھتے ہیں۔

ہمارے پاس سلطان محمد کے خط آئے تھے کہ ہندوستان کے علماء نے ہندوستانی غازیوں کو بدعقیدہ اور انگریز کے جاسوس قرار دیا ہے یہ تمہارا ملک بھی چھنوا

دیں گے اور دین و مذہب کو بھی خراب کریں گے۔[۲]

میری رائے میں یہ فتویٰ ولی اللہی خانوادے سے متعلق تھا۔ کیونکہ مولانا شاہ رفیع الدین کے دو صاحبزادے مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی متوفی ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۶ء، مولانا شاہ محمد موسیٰ دہلوی متوفی ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء اور مولانا رشید الدین خان دہلوی متوفی ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء اس وقت بقید حیات تھے۔ اور ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں مولانا عبدالحی بڈھانوی اور شاہ اسمٰعیل کو وہابیانہ عقائد پر مناظرہ میں شکست دے چکے تھے اور پھر فتویٰ میں جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے اس وقت اہل دہلی ہی ان باتوں سے صحیح طرح آگاہ تھے۔ پنجاب میں جو کہ رنجیت سنگھ کے زیر حکومت تھا سید صاحب کے عقائد اتنی وضاحت سے جاننے والا کوئی نہ تھا۔ سید صاحب کے معتقد خاص مولوی جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

میری موجودگی ہند کے وقت شاید پنجاب بھر میں دس وہابی عقیدے کے مسلمان موجود نہ تھے۔[۳]

مولانا تھانیسری ۱۸۶۵ء کو بمبئی (ہندوستان) سے جزیرہ انڈیمان گئے یعنی فتویٰ کے طشت ازبام ہونے سے ۳۵ سال بعد مولانا تھانیسری نے ہندوستان چھوڑا۔ جب ۳۵ برس بعد دس وہابی پنجاب بھر میں موجود نہ تھے تو ۳۵ سال پہلے پنجاب بھر میں کوئی ایک وہابی بھی نہ ہوگا۔ اس لئے جناب مہر کا یہ کہنا کہ "یہ رنجیت سنگھ ہی کا کام ہوسکتا ہے"۔ حقائق کے مطابق ہیں اور وہابیت سے اتنی واقفیت اور آگاہی اس وقت اہل دہلی کے علاوہ کسی کو نہ تھی اور دہلی کے ممتاز علماء میں مولانا رشید الدین خان، مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی، مولانا شاہ محمد موسیٰ دہلوی، مولانا کریم اللہ اور مولانا محمد شریف تھے۔

مزید یہ کہ فتویٰ پڑھنے کے بعد سید صاحب نے ان علماء کی تجہیل نہیں کی جن کی مہریں فتویٰ پر تھیں گویا مہریں ایسے لوگوں کی تھیں جنہیں سید صاحب عالم مانتے اور جانتے تھے ورنہ ضرور ان پر ردوقدح کرتے اور کسی کو نہ دکھانے کی تاکید تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مجاہدین میں ایسے لوگ موجود تھے جو سنی حنفی عقائد رکھتے تھے کہ مبادا یہی لوگ کوئی فساد نہ کر دیں۔

اسی اعتقادی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

بعض مخلص قدیم الخیال ہستیوں کو بھی سید صاحب کے بعض ساتھیوں کے طور طریقے، بلکہ عقائد بھی کھٹکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردارنِ پشاور اور علماء کا مجاہدین کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہو گیا۔ مجاہدین کے خارج از اسلام اور واجب القتل ہونے کے فتویٰ دیئے گئے۔[۴]

شیخ اکرام کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مجاہدین کے واجب القتل ہونے کے فتویٰ اعتقادی اختلاف کی بنیاد پر تھے۔ آخر مخلص اور قدیم الخیال ہستیوں کو مجاہدین کے عقائد کیوں کھٹکتے۔ کچھ تو تھا ورنہ واجب القتل ہونے کا فتویٰ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اسے آخری حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پھر اکثر سرحدی علماء نے سید صاحب کی مخالفت کی اور اس کی وجہ اختلافی عقائد ہی بتائی۔

دوسری طرف مجاہدین کو بھی سرحدی علماء اسلام کے عقائد اور طور طریقے پسند نہ تھے۔

جناب مہر لکھتے ہیں۔

تمام معاملات کی باگ ڈور ملاؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اور ملاؤں کی اعتقادی اور عملی حالت بہت گری ہوئی تھی۔[۵]

یعنی سرحدی علماء اسلام کی اعتقادی اور عملی دونوں حالتیں درست نہ تھیں اعتقادی درستگی سے شاید یہ مراد ہو کہ وہ فقہ حنفی پر عمل میں بڑے سخت تھے اور عملی حالت کی پستی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ ہندو پاک کے موجودہ علماء سے سرحدی علماء کی عملی حالت آج بھی اچھی ہے اور پہلے بھی اچھی ہوگی۔

میرے خیال میں سرحدی علماء اسلام میں ایک عیب تھا اور وہ اتنا عظیم تھا کہ تمام نیکیوں اور اچھائیوں کو ملیامیٹ کر گیا وہ عیب سید صاحب کو امیر المؤمنین تسلیم نہ کرنا تھا۔ اگر وہ ہندوستان میں تحریک وہابیت کے بانی سید صاحب کی امارت کو تسلیم کر لیتے تو تمام اچھائیاں ان میں آ جاتیں۔ لیکن ان حق گو علماء اسلام نے اپنا فرض منصبی ادا کیا۔ اس لئے آج بھی وہ تحریک وہابیت سے متاثرین کے نزدیک نہایت مغضوب و مقہور ہیں۔ سرحدی علماء کرام میں مجاہدیں کی مخالفت میں مرکزی کردار حضرت شیخ عبدالغفور اخوند اصواتی نے ادا کیا۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

اخوند صاحب صوات کے بڑے پیر اور ملا تھے۔ حضرت سید احمد بریلوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے لیکن بعد میں جب ان کے خلاف وہابیت کا الزام لگایا گیا تو یہ نہ صرف ان سے علیحدہ ہو گئے بلکہ عام روایت کے مطابق ان کی مخالفت میں سکھوں اور پٹھانوں سے مل گئے۔ [٦]

یعنی اخوند صاحب نے وہابیت کی مخالفت میں سکھوں اور پٹھانوں سے اتحاد کر لیا تھا۔ حالانکہ ابتدا میں وہ سید صاحب سے وابستہ تھے۔

مولوی محمد علی قصوری کے بیان کی تائید جناب مہر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

اخوند عبدالغفور جو بعد میں اخوند صاحب سوات کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس

زمانے میں بیکی (نزد ہنڈ) کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ایک غار میں رہتا تھا یہاں اس نے بارہ برس چلہ کشی میں گزار دیئے تھے۔ ملا صاحب کوٹھا سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ سید صاحب کے پاس بھی آتا جاتا تھا۔[۷]

ابتدا میں شیخ اخوند صواتی سید صاحب کے ہم نوا تھے۔ جب قصہ وہابیت کا چھڑا تو سربستہ راز کھلا تو اخوند صاحب نہ صرف الگ ہوئے بلکہ پرزور مخالفت کی۔ آپ کی مخالفت کی وجہ سے مریدین علماء خوانین اور عوام بھی کھل کر سامنے گئے ایک مسلمان حاکم خادی خان سے سید صاحب نے جو پہلا جہاد کیا اس کی کڑی بھی اخوند صاحب سے ملتی ہے۔ مولانا عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں۔

خادی خان شہید حضرت مولانا اخوند عبدالغفور قدس سرہ کے مخلص مرید تھے [۸] اسکے علاوہ جناب غلام رسول مہر کو بھی یہ اعتراف ہے کہ زہد وریاضت کی وجہ سے خادی خان کو بھی اخوند عبدالغفور کے ساتھ عقیدت تھی اخوند سوات میں اس زمانے میں بیکی میں مقیم تھا اور خادی خان کے ساتھ اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔[۹] اس لئے جب شیخ طریقت سید صاحب اور مجاہدین کے خلاف ان کی وہابیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے تو مریدین صادق اس معرکہ کارزار میں اتر آئے اور وہابیت کے خلاف تلواروں اور نیزوں سی جنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ خادی خان نے وہابی مجاہدین سے جنگ کی اور اس معرکے میں کام آیا۔ اسی طرح سلطان محمد خان کی جب مجاہدین سے جنگ ہوئی تو اس نے بھی اس وہابیانہ اعتقادی اختلاف کو دوٹوک لفظوں میں یوں بیان کیا۔

جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں۔ تم لوگوں کا عقیدہ برا اور نیت فاسد ہے۔ بظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہوس ہے۔ ہم نے خدا کے نام پر کمر باندھ لی

ہے کہ تمہیں قتل کریں تا کہ زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے۔[۱۰]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سرحدی مسلمان سید صاحب اور وہابی مجاہدین کی مخالفت ان کی اعتقادی جدت اور مسلمانوں کو مشرک و کافر کہنے کی وجہ سے کرتے تھے۔ سید صاحب کی سرحدی مسلمانوں سے اعتقادی جنگ تھی۔ سرحد کے علماء اور عوام سید صاحب اور مجاہدین کی وہابیانہ سرگرمیوں سے شدید متنفر تھے اور آگے چل کر اسی آگ نے مجاہدین کو خاکستر بنا دیا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

بے خبر اور سادہ لوح پٹھانوں کے اسلام کی باگ ڈور ملاؤں کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے خفیہ خفیہ سید صاحب کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور پٹھانوں کو اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف مشتعل کرنے لگے۔[۱۱]

مہر صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ سرحدی ملاؤں نے سید صاحب کی اسلام دشمنی کا الزام عائد کیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو سید صاحب کا مخالف بنا دیا لیکن سوال یہ ہے کہ آخر حضرت اخوند سواتی ایسے زاہد و عبادت گزار شخص نے سید صاحب کی مخالفت کیوں کی۔ کیا وہ اسلام کی سر بلندی نہیں چاہتے تھے؟ کیا انہوں نے ابتداً اسلام کے نام پر سید صاحب کی حمایت نہیں کی؟ سید صاحب اور مجاہدین میں وہابی عقائد کو دیکھ کر ہی اخوند صاحب اور دوسرے علماء مخالف ہوئے۔ اب اگر مہر صاحب کی مندرجہ بالا عبارت کی اس طرح تقلیب کر دی جائے تو سارے وہابی چراغ پا ہو جائیں گے کہ

سید صاحب نے مسلمانوں کو اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف مشتعل کیا۔ انہیں کافر و مشرک قرار دیا اور جانبین سے ہزاروں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔

تو اتنا غوغائے سگاں ہوگا کہ آواز گدا صدا بصحرا ہو کر رہ جائی گی۔

اس تنگ نظری کو دیکھ کر شدید حیرت ہوتی ہے کہ ایک صاحب علم وعرفان زہد وتقوی اور خادم اسلام کو اسلام کا مخالف قرار دینا اور دوسری طرف حقائق سے چشم پوشی کر لینا تاریخ کے طالب علم کی شان کے منافی ہے۔ وہابی مجاہدین کے اخلاق عالیہ کی مثال دیتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہو جانا کچھ بات ہی نہ تھا۔[۱۲]

مرزا حیرت گھر کے آدمی ہیں اور ان کی گواہی اہمیت کی حامل ہے جب مجاہدین کا یہ کردار تھا کہ معمولی سی بات پر ترکش کے تمام تیر چھوڑ دیئے جاتے تو ان بیچارے سرحدی مسلمانوں نے اگر کوئی جوابی کاروائی کی ہے تو اس پر انہیں دشمن اسلام کا لقب دینا کہاں کی دیانت ہے۔

سید صاحب کی (بقول ان کے) اسلامی حکومت کا ایک کارنامہ ملاحظہ کیجئے۔ کہ سنی حنفی مسلمانوں پر مجاہدین نے کیسے عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

ایک موقع پر جب مذکورہ جماعت (وہابی مجاہدین) کے ایک قائد قاضی سید محمد حبان کے اس ارشاد پر کہ جو اہل رسوم خدا اور رسول کے حکم کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں وہ عملاً کافر ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ "منية المصلی" میں اہل رسوم کو کافر نہیں کہا گیا تو اس کا جواب گھونسوں سے دیا گیا اور قائد موصوف نے اس وقت تک معترض کو نہ چھوڑا جب تک اس نے دوبارہ کلمہ نہ پڑھ لیا بالفاظ واضح تر اسے دوبارہ مسلمان بنایا گیا۔[۱۳]

گذشتہ حوالوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سید صاحب اور وہابی مجاہدین نے

سکھوں سے جہاد کو چھوڑ کر مسلمانوں کو کافر و مشرک بنانے کا منصب سنبھال لیا اور اس کا قدرتی ردعمل یہ ہوا کہ سرحدی علماء، سردار اور عوام سید صاحب اور مجاہدین کے خلاف صف آراء ہو گئے۔

۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۵۹

۲۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۰۰

۳۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ تواریخ عجیب ص ۱۸۴

۴۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر ص ۳۲

۵۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۴۵۸

۶۔ محمد علی قصوری۔ مولوی۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۷۶

۷۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص ۴۸۶

۸۔ تذکرہ اکابر اہلسنت۔ مولانا عبدالحکیم شرف قادری۔ ص ۴۲۸

۹۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۸۶۔۴۸۷

۱۰۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۱۴

۱۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۶۹

۱۲۔ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۱

۱۳۔ محمد اکرام شیخ۔ موج کوثر ص ۳۱

قاضیوں کی بدکرداری

مجاہدین سے سرحدی مسلمانوں کے اختلاف کی دوسری بڑی وجہ قاضیوں کی بدعملی اور بدکرداری تھی۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے یک طرفہ مواد ہے (یعنی سید صاحب کے معتقدین ومتوسلین کی تحریرات ہیں) جو لوگ اس گروہ سے اعتقادی اختلاف رکھتے تھے ان کی کوئی تحریر ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ورنہ یہ گوشہ مزید واضح ہوتا۔ سید صاحب کے سوانح نگاروں سے جو بہر کیف ان کے معتقد ہیں ان کی عیوب پوشی اور حقائق سے چشم بندی کے باوجود کچھ چیزیں حیطہ تحریر میں آ گئیں۔ ہم انہی کو پیش کرتے ہیں تاکہ حقائق حق اور ابطال باطل بہتر طور پر ہو سکے۔ سرحد میں مجاہدین کی بدکرداری ایک ایسا مسلمہ مسئلہ تھا جس کا ذکر عوام کے ہر طبقے نے کیا۔

سرحد کے علماء اسلام نے مجاہدین پر یہ اعتراض کئے۔

ا۔ مجاہدین نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذات جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم وتعدی کے خوگر ہیں۔ بلا وجہ شرعی مسلمانوں کے اموال ونفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۳۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً ''جدید الاسلام'' ہندوستانیوں کے حوالے کرتے ہیں۔[۱]

یہ تین اعتراض علماء اسلام کی زبان سے نکل رہے ہیں جو عموماً بڑی سوچ اور فکر کے بعد رائے عامہ قائم کرتے ہیں اور ابتداً میں ان علماء کا تعاون بھی مجاہدین کو حاصل رہا اس لئے ان حضرات کی بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ اب علماء کے اعتراضات کا سید صاحب کے متبعین کی تحریروں میں جائزہ لیں تو حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ چنانچہ مرزا حیرت دہلوی جو کہ سید صاحب کے معتقد خاص ہیں۔ قاضیوں

کی علمی وعملی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایک طرف چھوٹے چھوٹے ضلع وقصبہ گاؤں میں ایک ایک عمال سید صاحب کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ وہ بے چارہ جہانداری کیا خاک کرسکتا الٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے نئے احکام بے چارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا اور وہ اُف نہ کر سکتے تھے۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب ان پر حرام ہوگیا تھا۔ نہ کوئی منتظم تھا نہ کوئی دادرس تھا''۔[۲]

مہر صاحب سرحدی علماء اسلام کو برائیوں کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور سید صاحب کے مقرر کردہ قاضیوں کی بدکرداری اور بدعملی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ایک مؤرخ کے ایسے طرزِ عمل کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

سنیے مہر صاحب نے سید صاحب کے مخالف سرحدی علماء اسلام کو ''علماء سُوء'' قرار دیتے ہوئے وجہ مخالفت یہ لکھی ہے۔

کہ پہلے سرحدی علماء اپنی گزر بسر کیلئے مسلمانوں سے عشر لیتے تھے وہ سید صاحب لینے لگے اور دوسرا صوبہ سرحد میں فقہ حنفی کے مطابق میت کا حیلہ ہوتا تھا (اس سے علماء کو کافی رقم مل جاتی تھے) جسے سید صاحب نے بند کردیا۔

مہر صاحب بڑے دوراندیش آدمی ہیں وہ سمجھتے تھے کہ سرحدی علماء اسلام کی مخالفت وہابیت ایسی چیز ہے جسے پردہ اخفاء میں رکھنا ناممکن ہے۔ اسلئے علماء کی مخالفت کو اعتقادی اور ظالمانہ حکومت سے اختلاف کے بجائے معاشیات سے وابستہ کر کے سید صاحب کو منزہ عن العیوب اور علماء کو ''علماء سُوء'' قرار دے دیا اور بعد میں آنے والوں نے یہی سمجھا کہ مہر صاحب چونکہ مسلمان ہیں اور مسلمان جھوٹ نہ

بولتا نہ لکھتا ہے۔ جوں کا توں تسلیم کرلیا۔

لیکن مخالف علماء میں حضرت شیخ عبدالغفور اخوند سواتی، حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی، حضرت مولانا نصیر احمد قصہ خوانی ملا اور ملا عظیم اخوندزادہ سرفہرست ہیں۔ جن کا زہد واتقاء اور علم وعرفان میں بلند مقام مسلم ہی۔ اسلئے مہر صاحب کی الزام تراشی حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

خیر یہ تو وہابیت کے معتوب حضرات تھے۔ ذرا اپنوں کی سنئے اور آخر میں تطبیق کی زحمت بھی گوارا کر لیجئے۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

تمام ملک پشاور پر آفت چھا رہی تھی۔ انتظام سلطنت ان مسجد کے ملاؤں کے ہاتھ میں تھا جن کا جلیس سوائے مسجد کے دلودرسن کے کبھی کچھ نہ رہا تھا اور اب ان کو منتظم امور سلطنت بنا دیا گیا تھا۔[۳]

مزید سنیے۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کے بعض ساتھیوں کا رویہ ہمدردی اور معاملہ فہمی کا نہ تھا بلکہ وہ جلد ہی فاتحانہ تشدد پر اتر آئے۔[۴]

اب فاتحانہ تشدد کی حکایت بھی ملاحظہ کرلیں۔

مولوی مظہر علی نے یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصے میں ملک پشاور میں جتنی رانڈیں (عورتیں) ہیں۔ سب کے نکاح ہو جانے ضرور ہیں ورنہ اگر کسی گھر میں بے نکاح رانڈ رہ گئی تو اس کے گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔[۵]

یہ ہے فاتحانہ تشدد کا ادنیٰ مظاہرہ۔ کیا یہ معاملہ افہام وتفہیم سے نہیں ہو سکتا تھا کیا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک عورت نکاح ثانی نہیں کرنا چاہتی تو آپ اسکے مکان کو آگ لگا دیں، کیا قرآن وسنت میں کوئی ایسا حکم ہے؟ کاش کہ وہ یہ اعلان فرماتے۔

کہ نماز ادانہ کرنے والے کو شدید سزادی جائے گی۔

عیش ونشاط کے دلدادہ اور عورتوں کے رسیا وہابی مجاہدین نے نکاح ثانی کی آڑ میں کیا کھیل کھیلے۔ اپنوں کی زبانی سنیے۔

سید صاحب نے صدہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرح محمدی (ﷺ) کے موافق عمل درآمد کریں۔ مگر ان کی بے اعتدالیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ ان سے نکاح کرلیں اور بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جا رہی ہیں، مجاہدین میں سے کسی شخص نے انہیں پکڑا اور مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھالیا۔[٦]

یقیناً اب قارئین کو مولوی مظہر علی کے حکم کی وجہ سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ کیا یہی نکاح ثانی کے شرعی تقاضے ہیں۔ مزید سنیئے اور وہابی مجاہدین پر لاحول ولاقوۃ پڑھیے۔

ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی کہ میرا نکاح ثانی ہو۔ مگر مجاہد صاحب زور دے رہے ہیں نہیں ہونا چاہیے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالہ مجاہد کرتے اور ان کو کچھ چارہ نہ تھا۔[٧]

یاد رہے کہ یہ وہ مجاہد ہیں جو سکھوں سے جہاد کرنے سرحد آئے اور اب مسلمان لڑکیوں سے زبردستی نکاح کر کے نفس کو جہاد شہوانی کی تربیت دے رہے ہیں۔

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی ــــ ببری رونق مسلمانی

مجاہدین کی کذب بیانی: غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ منارہ خورد سے پیغام آیا کہ عشر کی جنس منگا لیجئے۔ رسالدار نے مستقیم

خان اور سلطان خان کو بھیج دیا۔ انہوں نے جنس لدوائی ناشتا کر کے چلنے لگے تو کسی سے شکر مانگی۔ اس نے کہا شکر نہیں گڑ موجود ہے۔ ابھی لائے دیتا ہوں۔ ان پر نفسانیت غالب آ گئی۔ ناراضگی کے جوش میں رسالدار کے پاس گاؤں والوں کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کہیں۔[۸]

یہ تھی سید صاحب کے وہابی مجاہدین کی عملی حالت اور طعنہ سرحدی علماء اسلام کو دیتے ہیں کہ ان کی علمی و عملی حالت صحیح نہ تھی۔ وہ دنیا پرست تھے، علماء سُوء تھے۔

مجاہدین کی اکثریت بدکردار تھی

مجاہدین کیسے لوگ تھے۔ سید صاحب کے جانثار سے سنیے۔

مجاہدین میں سب طرح کے آدمی تھے۔ برے بھی اور بھلے بھی۔ بلکہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ برے زیادہ اور بھلے کم تھے۔[۹]

یہ بات مولانا فضل حق خیر آبادی کے معتقد کی نہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل کے جانثار کی ہے۔ جناب غلام رسول مہر ایسے تمام حقائق کو پی گئے جن سے مجاہدین کے کردار کا دوسرا رخ سامنے آ سکتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سید صاحب مجاہدین کے جور و جفا، ظلم و ستم اور غیر شرعی حرکات سے آگاہ تھے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

قاضیوں سے مقامی لوگ عام طور پر نالاں تھے اور یہ شکایتیں سید صاحب تک بھی پہنچتی تھیں۔ مثلاً جب وہ ڈاگئی گئے تو خود مولوی خیرالدین شیرکوٹی نے ان سے کہا۔

مجھے جس بستی میں اترنے کا اتفاق ہوا، وہاں کے لوگوں کو قاضیوں کا شکوہ گزار

پایا۔وہ بعض اوقات معمولی خطاؤں پر زیادہ جرمانہ لے لیتے ہیں۔[۱۰]

اور مہر صاحب کو بھی یہ اعتراف ہے۔لکھتے ہیں۔

سید صاحب گڑھی امان زئی سے ڈاگئی پہنچے تو مولوی خیر الدین شیر کوٹی آ گئے۔انہوں نے عرض کیا کہ:۔

مجھے جس بستی میں اترنے کا اتفاق ہوا وہاں کے لوگوں کو شکوہ گزار پایا وہ بعض اوقات معمولی خطاؤں پر زیادہ جرمانہ لے لیتے ہیں۔[۱۱]

ان دونوں عبارتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سرحدی مسلمان وہابی مجاہدین کی اسلامی حکومت سے بڑے تنگ تھے۔اوران کی شکایات جائز تھیں کیونکہ مولوی خیر الدین قاضیوں کی شکایت سید صاحب سے کر رہے ہیں اور سید صاحب بھی وہابی مجاہدین کی بداعمالیوں سے آگاہ تھے تو کیا انہوں نے مجاہدین کے خلاف کوئی قانونی کاروائی کی یا ان کو اپنا سمجھ کے درگزر سے کام لیا۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

غضب یہ تھا کہ ان پر کوئی حاکم مقرر نہ تھا کہ پبلک ان کی اپیل اعلیٰ حکام کے آگے پیش کرے۔ان ہی بے دماغوں کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے تھے اور تسلیم کر لیے جاتے تھے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں کوئی بات بھی قابل تنسیخ اور ترمیم نہیں ہے۔[۱۲]

مرزا صاحب سید صاحب کے جوش محبت میں قاضیوں کے بداعمالیوں کی وجہ سے انہیں بے دماغ کہہ کر کوس رہے ہیں۔اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی شتر بے مہار تھے۔ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہ تھا۔اور سزا دینا تو بہت ہی بعید ہے۔

ملاحظہ فرمائیے۔

کبھی علانیہ طور پر سید صاحب کے کسی ساتھی کو سزا نہیں دی گئی حالانکہ اکثر ناجائز افعال ان سے سرزد ہوا کرتے تھے۔[۱۳]

بے چارے سرحدی مسلمانوں نے سید صاحب کو لاکھ سمجھایا اور درخواستیں کیں مگر سید صاحب ہل کے نہ دیئے۔ بلکہ الٹے سرحدی مسلمان ہی معتوب ہوتے۔

سید صاحب کی خدمت میں شکایتوں کی عرضیاں گزر رہی تھیں مگر وہاں کچھ بھی پرسش نہ ہوتی تھی۔ آپ کو یقین تھا شریعت کے ارکان کی پابندی کرنے کے چونکہ یہ عادی نہیں ہیں اور اب انہیں پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے یہ ہمارے آدمیوں سے ناراض ہوتے ہیں۔[۱۴]

سید صاحب سرحدی مسلمانوں کے زخموں پر دوا رکھنے کے بجائے نمک پاشی کرتے اور الٹا انہی کو مجرم گردانتے۔

یہ تھی سید صاحب کی اسلامی حکومت اور قاضیوں کی مختصر داستان۔ اور بیان بھی جانثاروں کا ہے۔ سید صاحب اور وہابی مجاہدین کی مخالفت کا سبب وہابیانہ عقائد اور قاضیوں کی بدکرداری تھی۔ جسے آپ ملاحظہ کر چکے ہم اس پر مزید کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ بات واضح ہے لیکن قبولِ حق کی توفیق نیک بخت کو ہوتی ہے۔

---

۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ٦٦٠
۲ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۱
۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۱
۴ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر ص ۳۱
۵ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۲
٦ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۰
۷ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۱
۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ٦٠۳
۹ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۰
۱۰ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر ۳۲
۱۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ٦٦۴
۱۲ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۱
۱۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۰
۱۴ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۸۲

مسلمانوں سے جہاد

سید صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکھوں کے ساتھ جہاد کا الہام ہوا تھا جس کی مختصر کیفیت آپ معلوم کر چکے اور جناب غلام رسول مہر کو سید صاحب کے انتقال سے ایک سو پچیس برس بعد الہام ہوا کہ سید صاحب انگریزوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ ایسا وقوع پذیر نہ ہوا لیکن حقائق یہ بتاتے ہیں کہ سید صاحب نے سنی حنفی مسلمانوں سے جہاد کیا۔

جب سید صاحب سکھوں کو زیر کرنے سے عاجز آ گئے۔ تو سنی حنفی مسلمانوں کی طرف توجہ کی اور ان میں اسلام کی روح نہ دیکھ کر فرمایا۔

''جہاد اسی صورت میں تائید آسمانی کے نزول کا باعث بن سکتا ہے۔ کہ سب لوگ حقیقی معنی میں مسلمان بن جائیں۔ جو کچھ کریں، خدا کی رضا کیلئے کریں۔ اسی صورت میں بدعات و منکرات اور معصیت امام سے پاک ہو کر خدا و رسول اور اولی الامر کی فرمانبرداری کا حق ادا کر سکتے ہیں اسی صورت میں کاروبار جہاد مستحکم و استوار ہو کر مطلوب نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ [1]

یعنی سید صاحب کی سرحد آمد سے پہلے مسلمان ''حقیقی مسلمان'' نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کچھ نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ بدعتی اور منکر تھے۔ خیر یہ تو سب الزام ہیں۔

حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ ''اطاعت امام'' یعنی سید صاحب کی اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہیں حقیقی مسلمان نہ ہونے اور بدعتی اور منکر کے القاب ملے۔ سنی حنفی مسلمان جب آباؤ اجداد سے شاہراہ اسلام پر گامزن تھے کیسے وہابی عقائد قبول کرتے اور سید صاحب کے مطیع ہوتے۔ اسی لئے سید صاحب کی بارگاہ سے کافر، منافق

اور باغی کے خطاب پاتے ہیں۔ سید صاحب سردار میر عالم باجوڑی کو اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

منافقین کے ساتھ جہاد کرنا بحکم ''مقدمۃ الواجب'' ایک واجب معاملہ ہے۔ اس لئے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قرب وجوار سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتار تک پہنچ گیا ہے۔[۲]

یہ منافق پشاور اور گردونواح کے وہ جلیل القدر مسلمان ہیں جو سید صاحب اور ان کی وہابیت کے خلاف تھے اور حضرت مولانا حافظ دراز پشاوری اور ملا عظیم اخوند زادہ اور ان کے فتویٰ کو ماننے والے تھے۔

شاہ اسمٰعیل دہلوی ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں۔

یہاں دو معاملے درپیش ہیں، ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل وخون کے جواز کی صورت نکالنا اور ان کے اموال کو جائز قرار دینا، اس بات سے قطع نظر کہ وہ ان کے ارتداد پر یا ان کی بغاوت پر مبنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا آیا کوئی سبب ہے یا کچھ اور ہے۔ جب کہ بعض اشخاص کے مقابلے میں ان کا مرتد ہونا ثابت ہو چکا ہے اور بعض کے متعلق بغاوت یا اس کا کوئی اور سبب اگرچہ پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے۔ کیونکہ ہم ان فتنہ پردازوں کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کو اہل کتاب کافروں کے مثل جانتے ہیں۔[۳]

یہ ''فی الحقیقت مرتد بلکہ اصل کافر'' کون لوگ ہیں۔ یہ سرحد کے بے چارے سنی حنفی مسلمان تھے۔ لیکن سید صاحب کی وہابیت قبول کر کے مطیع نہ ہو رہے تھے۔ اس

لئے مرتد و کافر کا تمغہ انعام ملا۔

سید صاحب سنی حنفی مسلمانوں سے اتنے خائف تھے کہ دور دراز کے سرداروں کو بھی یہی نصیحت کرتے کہ پہلے ان "کلمہ گو منافقین" کا قلع قمع کرو۔ چنانچہ رئیس قلات کو لکھتے ہیں۔

مناسب اور مصلحت یہ ہے کہ ایسا کیا جائے کہ سب سے پہلے منافقوں کے استیصال کے متعلق انتہائی کوشش کی جائے اور جب جناب والا کے قرب و جوار کے علاقہ میں ان بدکردار منافقین کا قصہ پاک ہو جائے تو پھر اطمینان خاطر اور دل جمعی کے ساتھ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے مصلحت وقت یہی ہے کہ پہلے تو منافقین کے فتنہ و فساد کے دفعیہ کیلئے سخت کوشش فرمائیں۔ [۴]

یعنی سکھوں سے زیادہ خطرناک دشمن سنی حنفی مسلمان ہیں۔ پہلے انہیں ٹھکانے لگایا جائے۔ بعد میں سکھوں کی فکر کی جائے۔ برادر کشی کی ناپاک مثال اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے لیکن مزید سنیے۔

چونکہ منافقوں اور فساد برپا کرنے والوں نے سرکش کفار کی حمایت پر کمر باندھ لی ہے اور مجاہدین سے دشمنی برت رہے ہیں۔ اس لئے ان کی گوشمالی اور کفر و فساد کے خلاف جہاد کی مہم چلانا ضروری ہے۔ اسی بناء پر میں نے تمام منافقین کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے مجاہدین کو ترغیب دی ہے...... اسکے بعد یہ عاجز اپنے سچے اور مخلص مجاہدین کے ساتھ لاہور کی طرف کفر اور سرکشی کے ازالے کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل مقصد پنجاب کے سکھوں سے جہاد کرنا ہے۔ [۵]

پہلے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جائے پھر سکھوں سے نبرد آزمائی ہو۔ بھلا سید

صاحب کی اس تحریک کو ''اسوہ رسول'' سے کیا واسطہ ہے۔ بے چارے سرحدی مسلمان سید صاحب کی ''خوئے وہابیانہ'' کی وجہ سے ان کی امارت کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ایمان کا علاج کرتے۔ الٹا سرحدی مسلمانوں کو بیمار سمجھ لیا اور تشخیص کے بعد علاج قتل تجویز کیا تھا۔

یاد رہے کہ سید صاحب کو سکھوں سے جہاد کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا تھا۔ غالباً سید صاحب مسلمانوں ہی کو سکھ تصور کر بیٹھے تھے اور سکھوں سے زیادہ جنگیں مسلمانوں سے کیں۔ معلوم نہیں الہام الٰہی کی نافرمانی ہوئی یا نہیں لیکن سید صاحب کو تسکین قلب ضرور حاصل ہوئی۔

اہل سرحد کا رسمی اسلام

سید صاحب سرحدی مسلمانوں کے بالکل خلاف تھے۔ ان کی کوئی ادا بھی سید صاحب کو پسند نہ تھی۔ جناب مہر لکھتے ہیں۔

(سید صاحب کو) یہاں پہنچ کر قریباً دو سال تک ایک ایک طبقے کے احوال ومراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام رسمی ہے۔

آگے جناب مہر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یقیناً اہل سرحد بھی اس وقت محض نام کے مسلمان رہ گئے تھے الا ماشا اللہ۔ عملاً ان کی پوری زندگی جاہلیت کے الواث سے آلودہ تھی۔ [۶]

سید صاحب کی دو سالہ تحقیق یہ تھی کہ سرحدی مسلمانوں کا اسلام رسمی ہے اور جناب مہر کی تحقیق بھی یہی ہے کہ وہ محض نام کے مسلمان تھے اور ان کی زندگی جاہلیت کی گندگی سے آلودہ تھی۔ حالانکہ سرحدی مسلمان آج بھی پاک وہند کے دیگر

مسلمانوں سے ایک ممتاز مذہبی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام سے ان کی والہانہ شیفتگی اور جاںنثاری ہی کی وجہ سے روس ایسی عظیم حکومت تین سال سے پیچ وتاب میں ہے۔ سید صاحب بے چارے تو روس کا پرکاہ بھی نہ تھے۔ صرف مذہبی اختلاف سے انہیں رسمی مسلمان کا طعنہ دے رہے ہیں ورنہ سرحدی مسلمان سکھوں کے بعد انگریزوں سے نبرد آزما رہے اور آج بھی مذہبی تصلب کی وجہ سے روس سے ٹکرا رہے ہیں۔ بحمداللہ وہ اس وقت بھی مسلمان تھے اور آج بھی مسلمان ہیں جبکہ سید صاحب کے نزدیک اعلیٰ درجہ کے اسلام والے انگریزوں کے حاشیہ بردار رہے اور ایک طرف انگریز اقتدار کو وسیع اور دیرپا کیا۔ دوسری طرف روس ایسی لادین حکومت سے اپنے تانے بانے ملائے۔

کلمہ توحید رسمی:۔ فتح خان رئیس پنجتار وہ شخص ہے جس نے سید صاحب کے گرتے ہوئے تشخص کو سہارا دیا۔ اور اسی کے دارالحکومت میں بیٹھ کر سید صاحب امیر المؤمنین اور نہ جانے کیا کیا ہوئے ایسے مخلص اور باوفا پختون مسلمان اور اس کی قوم کو سید صاحب نے چار سالہ رفاقت کے بعد فرمایا۔

آپ لوگ کلمہ توحید بھی محض عادۃً پڑھتے ہیں۔[۷]

یہ فتویٰ کیوں صادر ہوا۔ اس لئے کہ وہ سید صاحب کی ظالمانہ اور مسلم کش حکومت کی امداد واعانت سے عاجز آ گئے تھے اور سید صاحب کی سرحدی مسلمانوں سے نفرت بھی عجیب صورت اختیار کر گئی۔ فرماتے ہیں۔

مجھے ان لوگوں سے ایسی نفرت ہے جیسے کسی کو اپنی قے سے نفرت ہوتی ہے۔ میں ان کے ملک میں قیام سے بھی اسی طرح نفور ہوں۔[۸]

''مسلمان کو مسلمان سے قے کی طرح نفرت'' اسلامی روح اور مزاج کے خلاف ہے۔ سید صاحب کا یہ قول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات سے ٹکراتا ہے۔

مسلمانوں سے دس جنگیں:۔ یہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' تھا۔ ورنہ سید صاحب اور مجاہدین نے سرحدی مسلمانوں کو کافر و منافق قرار دیا (اور اس سے پہلے شاہ اسمعیل اہل دہلی کو بھی اسلام بدر ہونے کا سرٹیفکیٹ دے چکے تھے) اور سکھوں سے زیادہ خطرناک اور خوفناک سمجھتے ہوئے ان سے 9 جنگیں کیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جنگ اوتمان زئی۔ (۲) جنگ ہنڈ اول (۳) جنگ زیدہ

(۴) جنگ ہنڈ دوم (۵) جگن کینز ڑی (۶) جنگ کھلا بٹ

(۷) جنگ مردان (۸) جنگ مایار (۹) جنگ چھتر بائی (۱۰) جنگ پھلڑہ

یہ مسلمان سید صاحب کے بقول منافق اور کلمہ گو کافر تھے۔ اس لئے ان سے خوب معرکہ آرائیاں کیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کیا۔ انگریزی اقتدار کو بڑھنے یا بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔ حیرت ہوتی ہے ان کلمہ گو مسلمانوں پر جو یہ کہتے ہیں۔ ''کہ سید صاحب کی تحریک سے اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہنچی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اسی بیداری کی وجہ سے پاکستان بنا''۔ جب کہ سید صاحب اور ان کے گروہ نے مسلمانوں کو کافر بنایا۔ انہیں قتل کیا اور انگریزی اقتدار کیلئے راہ ہموار کی اور آج ان سید صاحب کو احیاء اسلام کا علمبردار قرار دیا جا رہا ہے۔ ہر کوتاہ نظر اور کم سواد تمام اسلامی تحریکوں کی ڈور سید صاحب کی شمشیر مسلم کش کے دستہ سے باندھنے کی فکر میں غلطاں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جو لوگ ''چشم حق بیں'' رکھتے ہیں وہ اس مسلم کش تحریک کے نشیب و فراز سے آگاہ ہیں۔ جناب غلام رسول مہر جنگ اوتمان زئی کے باب میں سید صاحب کی جنگی مہارت کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

(سید صاحب) خود توپ کھنچوا کر ایک اونچی جگہ لائے بھروائی خود شست باندھی

اورمرزا حسین بیگ کوحکم دیا کہ اب گولے پھینکو۔پہلی گولے میں دوسواڑ گئے۔[۹]

ایک وار سے دوسو مسلمان اڑانے والے سید صاحب کیا خادم اسلام ہو سکتے ہیں۔ جنگ زیدہ کے بارے میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

اس یورش میں یار محمد خان کے تین سوساتھی مارے گئے۔[۱۰]

اور جنگ مایار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

غازیوں کی کل اٹھائیس لاشیں انہیں ملیں۔ جنہیں دو قبروں میں دفن کرایا۔ اسی (۸۰) لاشیں درانیوں کی تھیں۔ان کی تدفین ملکیوں کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔[۱۱]

یہ تھے وہ مسلم کش سید صاحب جنہیں پاک وہند کی اسلامی تحریکوں کا بانی کہا جاتا ہے جو سینکڑوں مسلمانوں کا خون پی کر ''آدم خود'' ہو چکے تھے۔

مال غنیمت:۔ سید صاحب جو بزعم خویش امیر المؤمنین بھی تھے۔مسلمانوں سے جنگ کی صورت میں حاصل شدہ مال کو ''مال غنیمت'' [۱۲] سمجھتے اور فرماتے تھے۔ جناب غلام رسول مہر نے بھی کئی مقامات پر اسی اصطلاح کو استعمال کیا۔لکھتے ہیں۔

مولانا نے مال غنیمت کو جمع کروایا، مال غنیمت میں یار محمد خان کے کچھ کاغذات بھی ملے، جب پوار مال غنیمت پنجتار پہنچ گیا۔[۱۳]

اس اصطلاح سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سرحدی مسلمانوں کو حقیقتاً کافر سمجھتے تھے ورنہ ''مال غنیمت'' کی اصطلاح استعمال نہ کرتے۔

دوگانہ شکر:۔ سید صاحب سکھوں کی شکست سے اتنے خوش نہ ہوتے تھے جتنے مسلمانوں کی شکست سے مسرور ہوتے۔ کیونکہ جنگ اکوڑہ میں سکھوں کو شکست ہوئی

تو سید صاحب نے نماز شکر ادا نہ کی اور نہ ہی سکھوں سے دیگر چار جنگوں میں سید صاحب نے نماز شکر ادا کی۔ لیکن اس کے برعکس جب جنگ زیدہ میں سید صاحب کو سرحدی مسلمانوں کی شکست کی اطلاع ملی تو دوگانہ شکر ادا کیا۔ جناب مہر لکھتے ہیں۔

پنجتار پہنچتے ہی سید صاحب نے سب سے پہلے مسجد میں جا کر دوگانہ شکر ادا کیا۔[۱۴]

یقیناً سید صاحب کو حقیقی خوشی حاصل ہوئی ہوگی ورنہ دوگانہ شکر ادا نہ کرتے یاد رہے کہ یہ وہی سید صاحب ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکھوں سے جہاد کرنے کا الہام ہوا تھا۔ اور وہ مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر جب کامیابی حاصل کرتے تو نماز شکرانہ ادا کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو امیر المؤمنین کہنے والوں کی تجزیہ کی آنکھ بالکل پھوٹ چکی ہے اور وہ سید صاحب کی ہر ادا کو ادائے دلبری قرار دینے پر ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔

ردعمل:۔ جب سید صاحب اور مجاہدین نے سرحدی مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا زندگی خطرہ میں ڈال دی انہیں کافر و منافق بنا دیا تو انہوں نے (سید صاحب کے شب خون سے سبق لیتے ہوئے) مجاہدین پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا اور اس میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ بے شمار مجاہدین قتل ہوئے تو سید صاحب کو اسلام یاد آیا۔ بڑے رنجیدہ ہوئے اور فرمایا۔

سلطان محمد خان پر حیف ہے کہ اس نے خود ہمیں سب کچھ بتایا اور عذر کیا کہ غلطی ہوئی معاف کر دیجئے بعد ازاں اسی بہتان نامے کو دستاویز بنا کر صدہا مسلمانوں کا ناحق خون گرایا۔[۱۵]

کاش کہ سید صاحب سرحدی مسلمانوں کو ''مسلمان'' سمجھ لیتے۔ ان کا ''خون

ناحق'' نہ کرتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔لیکن سید صاحب دو دو سو مسلمان ایک توپ
کے گولے سے اڑا کر خوشی محسوس کرتے۔ ان کا مال ''مال غنیمت'' سمجھتے ان کی نماز
جنازہ ناجائز سمجھتے آخر وہ مسلمان تھے۔اور اب جب اپنے آدمی قتل ہوئے تو ''خون
ناحق'' ہو گیا بلکہ فرمایا۔

غازیوں کی لاشوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جس کی امید کفار سے بھی نہ تھی۔[١٦]

سید صاحب نے خود ہی تو انہیں کافر، کلمہ گو کافر، منافق اور غدار بنایا اور ان
سے کفار جیسا سلوک کیا۔ اب جوابی کاروائی سے اتنے دلگیر ہو گئے جناب مہر بھی
بحیثیت محقق اتنے ہی دل گرفتہ نظر آتے ہیں کہ مشہد اکبر اور کربلا زار کے لفظ اس واقعہ
پر استعمال کیے۔لیکن کل جب سرحدی مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں ان
کی عورتوں سے زبردستی نکاح ہو رہے تھے۔ان کا مال لوٹا جا رہا تھا کسی کے کان پر جوں
تک نہ رینگی۔کربلا یاد نہ آئی۔ بلکہ سب خوش تھے کہ اسلام نافذ ہوا ہے اور ہو رہا ہے
اور اب جب سرحدی مسلمانوں نے جوابی شبخون مارا تو خون ناحق ہو گیا۔سرحد کربلا
اور مشہد اکبر ہو گیا۔اہل سرحد کا یہ فعل یقیناً غلط تھا۔لیکن اس کی ابتداء کرنے والے بھی تو
سید صاحب تھے جنھوں نے نو جنگوں میں بے شمار مسلمانوں کا ''خون ناحق'' بہایا تھا۔
جو جرم سید صاحب کا ہے وہی اہل سرحد کو پھر کیا وجہ ہے کہ سید صاحب ''مسلم کش''
ہونے کے باوجود محسن الاسلام والمسلمین ہوئے اور اہل سرحد دشمن اسلام ٹھہرے۔

۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۶۰

۲۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوب سید احمد شہید ۱۳۵

۳۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوبات سید احمد شہید ص ۲۴۱

۴۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوبات سید احمد شہید ص ۴۷

۵۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوبات سید احمد شہید ص ۵۶،۵۷

۶۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۵۸

۷۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۰۲

۸۔ غلام رسول مہر سید احمد شہید ص ۷۰۱

۹۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۵۳

۱۰۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۲۷

۱۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۲۶

۱۲۔ مال غنیمت :۔ اصطلاح شریعت میں اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے جنگ کے نتیجہ میں حاصل ہو۔

۱۳۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۲۷،۲۹،۳۰

۱۴۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۵۳

۱۵۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۰۰

۱۶۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۰۲

سکھ مسلم اتحاد

سرحدی مسلمان اور سکھ طویل عرصہ سے باہم خون بہاتے رہے۔ سردار پائندہ خان بڑا بہادر اور بارعب سردار تھا۔ ہمیشہ سکھوں کو تاخت وتاراج کرتا رہا۔ سکھوں کو تنول پر نظر اٹھانے کی کبھی ہمت نہ ہوئی۔ سید مراد علی علی گڑھی لکھتے ہیں۔

''اوپر مانسہرہ وشنکیاری وغیرہ کے چند بار سردار پائندہ خان نے شب خون مارا۔ باوجود موجود ہونے فوج گراں سکھاں کے بہ حالت شب خون کوئی مقابلہ خاں موصوف کا نہ کرسکا۔ سکھ ورعایا کہ نام پائندہ خان کا سنتے ہی دل تھر تھراجاتا تھا۔ ایسا رعب پائندہ خان کو پروردگار نے دیا تھا۔[۱]

جناب غلام رسول مہر بھی پائندہ خان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''خان صاحب، بلند ہمت اور باتدبیر رئیس تھا............اس کی شجاعت واولوالعزمی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ سب سردار سکھوں سے دب گئے لیکن وہ ہزاروں مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود بدستور مقابلے پر جما رہا۔[۲]

ایسے بہادر اور دلیر سردار کے خلاف سید صاحب نے فتویٰ کفر دے کر جہاد کا اعلان کیا۔ پائندہ کو شکست ہوئی اور وہ اپنے قدیم دشمن سکھ سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگیا۔ سید مراد علی لکھتے ہیں کہ سردار پائندہ خان نے سردار ہری سنگھ کو اس مضمون کا خط لکھا۔

خلیفہ سید احمد نے میرا ملک چھین لیا ہے۔ آپ میری کمک کے لئے فوج روانہ کریں۔ میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا۔

سردار ہری سنگھ نے جواب لکھا۔

''میں کمک بھیجنے کیلئے تیار ہوں۔ لیکن ایک شرط پر کہ اپنا بیٹا جہانداد خان میرے پاس گروی رکھ دو۔ تاکہ باہم اعتماد باقی رہے''۔

چنانچہ سردار پائندہ خان نے اپنا بیٹا سردار ہری سنگھ کے پاس گروی رکھ دیا۔ ہری سنگھ کی فوج پائندہ خان کی امداد کیلئے آئی اور پھلڑہ کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔[۳]

جناب غلام رسول مہر کو بھی اعتراف ہے۔

''بعض روایتوں میں ہے کہ پھلڑہ پر غازیوں کی پیش قدمی کی خبر پائندہ خاں نے مانسہرہ بھیجی تھی''۔[۴]

یعنی مسلمان اور سکھوں نے سید صاحب کے خلاف اتحاد کر لیا۔ کیونکہ سید صاحب کی مسلم کش اور وہابیانہ حکومت کی داستانیں اہل ہزارہ سن چکے تھے اور مزید یہ کہ حضرت شیخ عبدالغفور اخوند سواتی کے خلفاء و مریدین اور حضرت حافظ دراز پشاوری کے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد ہزارہ میں موجود تھی۔ اس لئے ان حضرات نے مقامی مسلمانوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا اور لوگ سید صاحب کے خلاف ہو گئے۔

جنگ پھلڑہ میں سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی بریلوی لشکر کے قائد تھے۔ سید صاحب کے لشکر کو شکست ہوئی۔ سوائے چند آدمیوں کے تمام لوگ میدان میں ڈھیر ہو گئے۔

بالاکوٹ: بالاکوٹ وہ آخری معرکہ ہے جہاں سید صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ قتل ہوئے (یا آسمان پر تشریف لے گئے) بالاکوٹ اور گردونواح کے مسلمانوں نے بھی سید صاحب کے وہابیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے سکھوں سے اتحاد کر لیا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

سکھوں کے ساتھ اور ان کے زیر اثر ہزاروں مقامی مسلمان تھے۔ ان میں اکثر کے جسم بلاشبہ سکھوں کے فرمانبردار تھے۔[۵]

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ راستہ جس کی بدولت سکھوں کو کامیابی ہوئی۔ کسی مسلمان ہی کا بتایا ہوا تھا۔ جناب مہر رقمطراز ہیں۔

''مرزا احمد بیگ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے یا کسی کاذب کلمہ گو ملکی نے سکھوں کو اس راستے سے آگاہ کیا''۔[٦]

مزید تحقیق کیلئے مولانا جعفر تھانیسری کی بھی سن لیں۔

''اس عرصہ میں کسی پنجابی یا ولایتی (سرحدی) اہل گارڈ نے دنیا کی لالچ میں مخفی طور پر راجہ ہری سنگھ کے پاس جا کر اس کو راستہ کے مفصل حال سے مطلع کر دیا بلکہ اس کے آدمیوں کے ساتھ لے کر وہ راستہ بخوبی دکھلا دیا۔[۷]

مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں۔

ایک روز لشکر مجاہدین میں اسی ملک کا ایک مسلمان آیا غازیوں کو معلوم ہوا کہ یہ سکھوں کے لشکر کا جاسوس ہے۔[۸]

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں۔

پہاڑی بدذات قومیں روپیہ کے لالچ سے مسلمان ہو کے سکھوں سے گٹھ گئی تھیں۔[۹]

مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں۔

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہید اور ان کے ساتھی شہید کر دیئے گئے اور خود آزاد قبائل میں سے بعض لوگوں نے ہندوستانی مجاہدین کو لوٹا کھسوٹا اور قتل

تک کیا۔[۱۰]

مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

جب حضرت سید صاحب اوران کے رفقاء کرام پٹھانوں کی غداری سے ہری سنگھ نلوہ کے ہاتھ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔[۱۱]

مولانا فضل حسین بہاری لکھتے ہیں۔

جب سکھوں نے دیکھا کہ عنقریب مسلمان تمام پنجاب پر قابض ہو جائیں گے تو انہوں نے اپنے آپ کو گھانٹھا اوراس بے وفا (سرحدی) قوم نے عین حالت جنگ میں بے وفائی کی جس سے مسلمانوں کوشکست ہوئی۔[۱۲]

آخر میں سرسید کی سنیے۔

ہندوستان کے گوشہ شمال ومغرب کی سرحد پر جو پہاڑی قومیں رہتی ہیں وہ سنی المذہب حنفی قومیں ہیں .... چونکہ پہاڑی قومیں ان کے عقائد کی مخالف تھیں اس لئے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کرسکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے۔مگر البتہ چونکہ وہ سکھوں کے جوروستم سے نہایت تنگ تھے۔اس سبب سے وہابیوں کے اس منصوبے میں شریک ہو گئے کہ سکھوں پرحملہ کیا جائے ....لیکن چونکہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کرلیااور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وسید احمد صاحب کوشہید کرلیا۔[۱۳]

سید صاحب کے سوانح نگاروں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جنگ بالاکوٹ میں سید صاحب کے خلاف سکھ اور مسلمان دونوں متحد ہو گئے تھے۔اس وقت مسلمانوں کے

سامنے دو طاقتیں تھیں ایک ''مار جان'' اور دوسری ''مار ایمان'' مسلمانوں نے ''مار جان'' یعنی سکھوں سے ''مار ایمان'' کو ختم کرنے کے لئے اتحاد کر لیا اور اس طرح ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جمعہ کے روز زبردست جنگ ہوئی۔ سید صاحب اپنے رفقاء سمیت ہمیشہ کیلئے سو گئے۔

سید صاحب قبر میں پہنچ گئے لیکن ان کی تفریق اور تکفیر بین المسلمین کی تحریک آج بھی موجود ہے۔ مسلمان باہم دست و گریباں ہیں۔ سینہ چاکی سے گردن کشی تک کی نوبت آتی رہتی ہے۔ چونکہ یہ پودا سید صاحب کا لگایا ہوا ہے اس لئے اس کارِ خیر کا اجرانہیں ضرور مل رہا ہوگا لیکن افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو آج بھی سید صاحب کی مسلم کُش تحریک کو ہندوستان میں احیاء دین کی ایک عظیم تحریک سمجھتے ہیں۔ کاش کہ وہ لوگ سید صاحب کی سوانح پر ایک حقیقت پسندانہ نظر ڈال لیتے۔

۱۔ سید مراد علی۔ تاریخ تناولیاں ص ۴۸

۲۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۴۱

۳۔ سید مراد علی۔ تاریخ تناولیاں ص ۵۱، ۵۲، ۵۳

۴۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۶۸

۵۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۵۲، ۷۵۰

۶۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۵۱

۷۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۲۸۴

۸۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۴۱۵

۹۔ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۹۱

۱۰۔ عبیداللہ سندھی مقدمہ، کابل میں سات سال ص ۱۶

۱۱۔ محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۸

۱۲۔ مولانا فصل حسین بہاری۔ الحیات بعد الممات ص ۲۰۴

۱۳۔ مقالات سر سید نہم ص ۴۰، ۱۳۹

لاش کنہار برد ہوگئی

سید صاحب کے مدفن کے بارے میں سوانح نگاروں میں اختلاف ہے بایں وجہ تین مقامات پر سید صاحب کے دفن ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔ بالاکوٹ، تلہٹہ، گڑھی حبیب اللہ۔

بالاکوٹی مدفن:۔ .... ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سید صاحب سکھوں اور مسلمانوں سے جنگ لڑتے ہوئے قتل ہو گئے۔ سکھ جرنیل شیر سنگھ نے لاش کو شناخت کے بعد بالاکوٹ میں دریائے کنہار کے کنارے دفن کرادیا۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ میدان جنگ میں دیکھ بھال کر کے ایک لاش کے متعلق بتایا گیا۔ یہ سید صاحب کی معلوم ہوتی ہے اس کا سر نہ تھا۔ سر بھی تلاش کر کے ساتھ ملایا گیا تو جاننے والوں نے اقرار کیا کہ واقعی سید صاحب کی ہے۔ اسے اعزاز کے ساتھ دفن کردیا گیا۔ شیر سنگھ فوج لے کر چلا گیا اور نہنگ سکھوں کی ایک جماعت پیچھے رہ گئی۔ پھر جب رات ہوئی تو ان اکالیوں نے اس لاش مذکورہ کو قبر سے نکلوا کر ندی میں ڈلوادیا اور اپنے لشکر کو چلے گئے۔[۱]

اس اقتباس سے عیاں ہوتا ہے کہ بالاکوٹی قبر سید صاحب کی نعش سے خالی ہے۔ وہابی معتقدین بے وجہ شدّ رحال کرتے ہیں اور وہاں کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے ہیں۔

جناب غلام رسول مہر مزید لکھتے ہیں۔

غرض بالاکوٹ میں جس قبر کو اب سید صاحب کی قبر بتایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں یا اسکے آس پاس سید صاحب دفن

ہوئے۔ایک دن ایک رات یا دو دن دو راتیں وہاں دفن رہے۔ پھر آپ کی لاش اس میں سے نکال کر دریا میں پھینک دی گئی اور قبر بے نشان رہ گئی۔[۲]

جناب غلام رسول مہر کو اس موجودہ قبر میں ایک دو دن بھی دفن رہنے میں شک ہے۔

تواریخ ہزارہ کے مصنف مہتاب سنگھ کانپوری بھی ان ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ شیر سنگھ کے چلے جانے کے بعد مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ نے باہم صلاح کی کہ جب تک سید صاحب زندہ رہے۔اس ملک میں شور و فساد برپا رہا۔ اب اگر یہ قبر باقی رہی تو بہت سے مسلمان اس کی پرستش شروع کر دیں گے اور ان کی کرامتیں نمایاں کریں گے بہتر یہ ہے کہ ان کی میت نکال کر دریائے کنہار میں ڈال دی جائے۔ وہاں اس وقت آٹھ نہنگ سکھ کھڑے تھے۔ مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ نے انہیں پچیس پچیس روپے دے کر کہا کہ ثواب کا کام ہے۔خلیفہ صاحب کی لاش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دو جو پاس ہی ہے۔ چنانچہ نہنگوں نے فوراً سید صاحب کی میت قبر سے نکالی اور تلوار سے جوڑ الگ الگ کئے اور دریا میں ڈال دیئے۔[۳]

بالاکوٹی قبر کے بارے میں مولانا ابوالحسن ندوی اپنی رائے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سید صاحب کے مدفن کے متعلق تمام روایتوں اور بیانات کو جمع کرنے کے بعد جو بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا جسم و سر مبارک جمع کر کے اس قبر میں دفن کیا گیا۔ جو دریائے کنہار کے قریب ہے اور آپ کی طرف منسوب ہے۔ پھر وہ نعش نکال لی گئی اور دریا میں ڈال دی گئی۔[۴]

مولانا ندوی کی شرعی گواہی کے بعد اب لوگوں کو یہ خیال دل سے نکال دینا

چاہئے کہ ''بالاکوٹی قبر'' سید صاحب کی حقیقی قبر ہے۔ جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ایک طویل عرصہ تک سید صاحب کی قبر کا نشان کسی کو معلوم نہ تھا۔ نواب وزیر الدولہ نے جب اپنی کتاب ''وصایا الوزیر'' لکھوائی تو اس وقت بھی سید صاحب کی قبر بے نشان تھی اور تقریباً ۶۲ برس بعد موجودہ قبر وجود میں آئی لکھتے ہیں۔

۱۸۹۳ء میں خان عجب خان برادرزادہ خان ارسلا خان زیدہ مانسہرہ میں نائب تحصیل دار مقرر ہو کر گئے تو انہوں نے سید صاحب اور شاہ (اسمٰعیل) صاحب دونوں کی قبروں کا سراغ لگانا چاہا۔ وہ اس خاندان کے فرد تھے جو سید صاحب کی عقیدت میں برابر ثابت قدم رہا تھا۔ سن رسیدہ اور واقف کار آدمیوں کو جمع کر کے پوری چھان بین کرائی پھر کم وبیش باسٹھ برس کے بعد ان قبروں کے نشان قائم کیے۔ [۵]

اس واقعہ پر تبصرہ بھی مہر صاحب ہی کے قلم سے نکلے ہوئے حروف میں پڑھیے تاکہ ''شہادت خانہ'' کی وجہ سے قبول حق آسان ہو جائے۔

غرض موجودہ قبر باسٹھ برس تک بے نشان رہنے کے بعد بنی اور یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک اسی جگہ بنی جہاں پہلی قبر تھی۔ اگر یہ اسی جگہ بنی تو اسے اس قبر کا مقام سمجھنا چاہئے جہاں سید صاحب کی لاش ایک یا دو راتیں دفن رہی۔ [۶]

دیگر دو مدفن:۔ تلہٹہ اور گڑھی حبیب اللہ سید صاحب کے دوسرے دو مدفن مشہور ہیں۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ سید صاحب کی لاش جب سکھوں نے دریائے کنہار میں ڈال دی تو راستہ میں تلہٹہ والوں کو سید صاحب کا ''تن'' ملا تو انہوں نے اسے غیر معلوم مقام میں دفن کر دیا اسی طرح گڑھی حبیب اللہ والوں کو ''سر'' ملا تو انہوں نے اسے دریائے کنہار کے کنارے دفن کر دیا۔

جناب غلام رسول مہر کا طویل اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

لاش دریا میں گرتے ہی تیرتی تیرتی تلہٹہ پہنچی جو بالاکوٹ سے تقریباً ۹ میل جنوب میں کنہار کے مشرقی کنارے کا ایک گاؤں ہے۔ سر اور تن پہلے ہی الگ الگ تھے۔ دریا میں گرے تو الگ الگ ہی رہے۔ تلہٹہ والوں نے تن کو دیکھا تو اسے پکڑ کر پاس کے کسی کھیت میں نامعلوم مقام پر دفن کر دیا۔ میں جس حد تک مختلف اصحاب سے دریافت کر سکا ہوں، اس مدفن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سر بہتا بہتا گرھی حبیب اللہ خان کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچ گیا، جہاں آج کل پُل بنا ہوا ہے۔ گڑھی والوں میں ایک قصہ مشہور ہے، جسے عجائب پسندیوں کی رنگ آمیزی سے الگ کیا جائے تو اتنا رہ جاتا ہے کہ سر گڑھی کے سامنے پہنچ کر مشرقی کنارے پر اٹک گیا۔ ایک بڑھیا پانی بھرنے کے لئے آئی اس نے دیکھ کر خان کو خبر پہنچائی وہ دوڑا ہوا آیا اور سر کو دریا سے نکال کر کنارے ہی پر دفن کر دیا۔ یہ مدفن پل سے گزرتے ہی کنہار کے مشرقی کنارے پر بائیں ہاتھ ملتا ہے۔ پہلے اس کی قبر چھوٹی سی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ صرف سر کی قبر ہے اور اس پر سرخ رنگ کا کپڑا پڑا رہتا تھا۔ گڑھی کے اکثر لوگ صبح کے وقت وہاں فاتحہ و دعا کے لئے آتے تھے اب سیمنٹ سے پوری قبر بنا دی گئی ہے بتایا جاتا ہے کہ یہ قطب بابا غازی کی قبر ہے۔[۷]

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ مدفن تلہٹہ اور گڑھی حبیب اللہ بالکل اختراعی اور وضعی ہیں اور مہر صاحب نے بھی جملہ معترضہ کے طور پر لکھ دیا ہے ''میں جس حد تک مختلف اصحاب سے دریافت کر سکا ہوں اس مدفن کا کوئی سراغ نہیں ملتا'' گویا انہیں تلہٹوی قبر کے اختراعی ہونے کا برملا اعتراف ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی شک و ارتیاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سر اور جسم الگ الگ بہتے بہتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور دو علیحدہ مقامات پر دفن کئے گئے ممکن ہے کہ سر اس جگہ دفن کیا گیا ہو جو گڑھی حبیب اللہ میں آپ کے سر کے مدفن کی حیثیت سے مشہور ہے اور جسم تلہٹہ میں مدفون ہو۔ جہاں آپ کی قبر بتلائی جاتی ہے۔[۸] ممکن اور ہو سے مولانا ندوی کی غیر یقینی کا اظہار ہو رہا ہے وہ بھی ان دونوں قبروں کو سید صاحب کا مدفن قرار دینے کیلئے تیار نہیں ہو رہے ہے۔ جس سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں قبریں اختراعی ہیں اور ان کا کوئی تحقیقی ثبوت آج تک مہیا نہیں ہو سکا اور ہو بھی کیسے، کون جانتا تھا کہ دریا کنہار میں بہتا ہوا یہ "تن" سید صاحب کا ہے اور گڑھی حبیب اللہ کے باسیوں کو کیا معلوم تھا کہ دریا کنہار کے کنارے اٹکا ہوا یہ "سر" سید صاحب کا ہے۔

۱۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۰۵

۲۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۰۶

۳۔ مہتاب سنگھ کانپوری۔ تواریخ ہزارہ بحوالہ سید احمد شہید ص ۸۶۰

۴۔ مولانا ابوالحسن ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۴۴۹

۵۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۰۷

۶۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۰۷

۷۔ مولانا غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۰۵، ۸۰۶

۸۔ مولانا ابوالحسن ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۴۴۹

امام مہدی تھے

حدیث مہدی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئی کئی لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اپنے اقتدار اور اثر و رسوخ کو بڑھانے اور اسے دیر پا کرنے کی ہوس و خواہش میں مہدی بنے اور بنائے گئے۔ سید صاحب کو ان کے متبعین نے ان کی زندگی میں مہدی موعود کہا اور سمجھا۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

''جب مولانا (شاہ اسمٰعیل) شہید کی پہلی نظر چہرہ مبارک سید صاحب پر پڑی تو فرمایا اگر یہ بزرگ اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کرے تو میں بلا تامل اس کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔[۱]

مولانا شاہ اسمٰعیل کوئی عام آدمی نہ تھے۔ سید صاحب کی تحریک کے روح رواں اور قائد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا یہ کہنا ''تو میں بلا تامل اس کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا''۔ حکمت اور دور اندیشی سے خالی نہ تھا۔ شاہ اسمٰعیل واقعی آپ کو مہدی موعود سمجھتے تھے اور علماء سرحد کو جو اعتراضات مجاہدین پر تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ مولانا اسمٰعیل نے اور بعض دوسرے لوگوں نے سید صاحب کو مہدی موعود قرار دیا ہے۔[۲]

علماء سرحد کا یہ اعتراض بے معنی اور بے اصل نہیں کیونکہ علماء سرحد نے سید صاحب اور مجاہدین کو بڑے قریب سے دیکھا تھا اور پھر علماء سرحد کے اعتراض کی تائید مرزا حیرت دہلوی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے۔

ان (شاہ اسمٰعیل) کی عربی کے علم وادب اور علوم مختلفہ سے عظیم الشان واقفیت نے عام طور پر انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پیر کے مہدیت کے لقب کی جس کو انہوں نے خود قبول کرلیا تھا۔ بہت زور وشور سے تائید کریں اور لوگوں میں منوائیں۔[۳]

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب کے مہدی موعود ہونے کی تبلیغ وتشہیر کی اور جم غفیر کو اپنا ہم عقیدہ کرلیا اور عرصہ دراز تک لوگ سید صاحب کے مہدی موعود ہونے کے قائل رہے۔شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

سید صاہب کے بعض معتقدین جوانہیں مہدی موعود سمجھتے تھے یہ خیال کرتے رہے کہ سید صاحب غائب ہو گئے ہیں۔[۴]

سید صاحب کو مہدی موعود کہنے اور سمجھنے والے مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا فصل رسول بدایونی کی معتقد و مرید نہ تھے بلکہ سید صاحب کے خدمتگار، نمک خوار اور ہم نشین وہم جلیس تھے۔سید صاحب کے ایک دوسرے جانثار لکھتے ہیں۔

اگر اس بزرگ (سید احمد) کو مجدد تیرہویں صدی یا مہدی وسط کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔[۵]

الفاظ کی اونچ نیچ ہے۔مقصد ''مہدی موعود'' ہے۔

حکیم مومن خان کا نظریہ:۔

حکیم مومن خان سید صاحب کے بڑے معتقد تھے۔سید پرستی میں اپنے قریبی دوست حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی سے بھی الجھ گئے تھے عقیدت کے سیلاب میں ایسے بہے کہ سید صاحب کے مہدی موعود ہونے کے قائل ہو گئے لکھتے ہیں۔

جوسید احمد امام زماں واہل زماں

کرے ملاحد بے دین سے ارادہ جنگ

تو کیوں نہ صفحہ عالم یہ سال وغا

''خروج مہدی ۱۲۴۲ کفار سوز'' کلک تفنگ[۶]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔

وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سال خروج

''امام برحق مہدی ۱۲۴۲ نشاں علی فر'' ہے [۷]

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب کے مریدین و معتقدین کی ایک بڑی تعداد ان کو ''مہدی'' سمجھتی تھی۔ اسی پر ان کی موت ہوئی۔ اب ہم مہدی بننے اور بنانے والوں کا فیصلہ (کہ وہ گمراہ اور بد دین تھے یا نہیں) قارئین پر چھوڑتے ہوئے سید صاحب کے آسمان پر تشریف لے جانے کا قصہ چھیڑتے ہیں۔

---

۱ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۳۰۱
۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۶۰۶
۳ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۲۰۹
۴ شیخ اکرام۔ موج کوثر ص ۳۳
۵ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۵۱
۶ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۷۱
۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۷۲

آسمان پر تشریف لے گئے

حضرت امام مہدی کے بارے میں اہل تشیع کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ایک غار میں غائب ہو گئے ہیں اور قرب قیامت کے وقت ان کا ظہور ہو گا۔ لیکن سید صاحب کے معتقدین ایک قدم آگے بڑھے اور کہا کہ سید صاحب کا ''رفع الی السماء'' ہو گیا ہے یعنی آسمان پر تشریف لے گئے ہیں اور عنقریب واپس آئیں گے۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

مجاہدین کو یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ عین لڑائی میں ان کا ''رفع الی السماء'' ہوا اور اب وہ واپس تشریف لانے والے ہیں۔ یہی مجاہدین ان کے اصحاب صُفہ بنیں گے اور وہ پھر ہندوستان کو فتح کریں گے۔[۱]

رفع الی السماء کی بات اتنی عام اور مشہور ہوئی کہ مرزا حیرت کو بھی لکھنا پڑا کہ مجاہدین کو یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب مجسم آسمان پر بلائے گئے اور دوبارہ تشریف لائیں گے۔[۲]

یعنی سید صاحب آسمان پر چلے گئے ہیں اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح دوبارہ زمین پر واپس آئیں گے۔ بلکہ سید صاحب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یک گونہ فضیلت بھی حاصل ہے آپ کے مرید خاص مولوی ولایت علی عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

ہمارے حضرت کی خلافت کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ان کے ظہور میں بعید عرصہ گزرے گا۔ یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوڑی سی کوشش میں حضرت کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ عرصہ قریب میں خورشید درخشاں کی مثل ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوار ہدایت سے منور فرمائیں گے۔[۳]

یعنی سید صاحب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ فوقیت اور برتری حاصل ہے کہ لوگوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔

سید صاحب کی غیاب اور ظہور کے بارے میں آپ کے معتقدین ومتوسلین کا یہ اکثریتی فیصلہ تھا کہ وہ بالاکوٹ میں قتل نہیں ہوئے غیب ہو گئے ہیں اور عنقریب ان کا ظہور ہو گا۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

جماعت مجاہدین کے اکثر راسخ العقیدہ لوگوں کو یہ یقین تھا کہ حضرت سید صاحب دوبارہ تشریف لائیں گے اور اس جہان کو الحادوزندقہ اور کفروشیعت سے پاک کر دیں گے۔ چنانچہ مجاہدین کی جماعت میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا موجود تھا جو نہایت متدین تھے اور نہایت خشوع خضوع سے ہر وقت دعا کرتے تھے کہ خدایا! ہمارا ابتلا کا دور ختم ہو اور سید صاحب دوبارہ تشریف لائیں۔ چنانچہ جب میں پہنچا تو کئی راسخ العقیدہ مسلمانوں نے مجھ سے اپنے رؤیا بیان کئے کہ حضرت سید صاحب ان کے خواب میں تشریف لائے ہیں اور فرما گئے ہیں کہ ہم اب ظاہر ہونے والے ہیں۔ ایسے خوابوں کی کثرت سے اشاعت کی جاتی اور حکمران طبقہ (امیر المجاہدین اور ان کی حواری) کی طرف سے ان کی ذریعہ ہندوستان اور یاغستان کے جہال کے حسن ظن سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی جاتی۔ وہ لوگ دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ جب تک حضرت سید احمد صاحب تشریف نہ لائیں گے۔ اس وقت تک جہاد کی تیاری کرنا فضول تھا۔ حضرت سید صاحب کے ساتھ فرشتوں کا ایک جرّار لشکر ہوگا اور فتح ونصرت ان کی رکاب تھامے ہوگی۔ [۴]

کذب بیانی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے فرشتوں کا لشکر جرار بھی ساتھ ہوگا۔ اس کے باوجود ان کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کوئی فتویٰ حرکت میں نہ آیا بلکہ وہ

نہایت ہی متدین لوگ تھے۔ یہ جانب داری کیوں؟

چند مزید حوالے ملاحظہ کریں شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

ہزارہ گزیٹر کے بیان کے مطابق ہندوستانی مجاہدین یہ اعلان کرتے ہوئے جمع ہوئے کہ خلیفہ سید احمد شہید نہیں ہوئے بلکہ بہت جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔[۵]

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

ایک بڑا گروہ جن میں سرحد کے مقیم اور اہل صادق پور اور ان کے متوسلین تھے۔ سید صاحب کی غیبت کا قائل آپ کے ظہور کا منتظر اور آپ کیلئے چشم براہ تھا۔[۶]

جناب غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے ان کی غیبو بت کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور مدت تک اس عقیدے کی اشاعت پورے اہتمام سے جاری رکھی۔[۷]

یعنی سید صاحب کی غائب ہونے کی اشاعت پورے اہتمام سے ہوتی رہی اور لوگوں کو یہ دعوت بھی دی جاتی رہی۔

صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے انہیں باقاعدہ یقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے وہ امام وقت ہیں۔[۸]

سید صاحب کے خاندان کے لوگوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ مولانا تھانیسری لکھتے ہیں۔

سید صاحب کے اکثر اقربا اور اہل قافلہ آپ کی غیبو بیت کے قائل تھے۔[۹]

مولوی یحییٰ علی عظیم آبادی سید صاحب کی غیبت کے بعد ملاقات کے اشتیاق میں مندرجہ ذیل اشعار پڑھا کرتے۔

جب صبا کوئے یار سے گزرے　　اتنا پیغام درد کا کہنا

دن بہت انتظار میں گزرے　　کون سی رات آپ آئیں گے [۱۰]

مولوی جعفر علی تھانیسری لکھتے ہیں:

مجھ کو حضرت مرشدنا کی حیات وظہور کا ایسا یقین ہے جیسے اپنی موت کا۔[۱۱] پھر لکھتے ہیں مولوی حیدر علی صاحب اوران کے فرزند کو ۱۳۰۲ھ میں زیارت کا فخر حاصل ہوا۔ مولوی حیدر علی صاحب تو بعد حصول قدم بوسی چند ماہ انتقال کر گئے اور ان کے فرزند زندہ موجود ہیں۔[۱۲]

دیو بند کا نظریہ غیبت: مولوی ظفر حسین کاندھلوی فرماتی تھے کہ میں نے سید صاحب سے دس باتیں سنی تھیں جن میں نو پوری ہو چکی ہیں ایک باقی ہے یعنی آپ کی غیبت وظہور منشی محمد ابراہیم نامی شخص نے مولانا گنگوہی نے کی محفل میں ایک مرتبہ کہا کہ ممکن ہے سید صاحب ابھی زندہ ہوں مولانا گنگوہی کہا بلکہ اَمکن (زیادہ ممکن) ہے۔[۱۳]

گویا مولانا کاندھلوی اور مولانا گنگوہی بھی سید صاحب کی غائب ہو جانے کے عقیدہ پر یقین واثق رکھتے تھے۔ اس اسلامی جرم میں چونکہ بڑے بڑے لوگ شریک ہیں۔ اس لئے ہم مہر بلب ہیں۔

۱ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل ویاغستان ص ۱۱۴

۲ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ ص ۴۴۳

۳ ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۴۴۴

۴ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل ویاغستان ص ۱۱۸

۵ شیخ اکرام۔ موج کوثر ص ۵۱

۶ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید ص ۴۴۳

۷ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۱۰

۸ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۱۴

۹ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی ص ۲۹۰

۱۰ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ تواریخ عجیب ص ۹۳

۱۱ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۴۵

۱۲ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۴۵

۱۳ مولانا اشرف علی تھانوی۔ ارواح ثلثہ ۱۴۱

مجسمہ گری اور مجسمہ پرستی

آدمی کی شناخت اس کی ہم نشینوں اور دوستوں سے ہوتی ہے۔ سید صاحب کے ہم نشین کس قبیل اور قماش کے لوگ تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں جو ہوا سو ہوا بعد میں انہوں نے سید صاحب کا ''رفع الی السماء'' کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے افضل قرار دیا۔ مہدی موعود بنایا اور سب سے بدترین حرکت یہ کی کہ سید صاحب کا بت بنا کر سادہ لوح مسلمانوں سے سیم وزر وصول کر کے اپنی عاقبت خراب کر لی۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے۔

ایک عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہو جانے کی کرامت کے متعلق تحقیقات کرنا کرامت سے خالی نہیں تھا............ ایک جانثار مبلغ............ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف چلا گیا............ اس نے یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ کوہستانی علاقہ میں اس غار تک ضرور پہنچے گا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہی کہ خدا نے امام کو چھپا رکھا ہے جب وہ اس خانقاہ کے دروازے کے اندر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ تین انسانی مجسمے گھاس بھرے ہوئے موجود ہیں یہ مبلغ وہاں سے بھاگا اور مریدوں کو خط لکھا۔ ملا قادر نے امام کا بت بنایا ہے کہ مگر کسی کو دکھانے سے پہلے یہ وعدہ کر لیتا کہ نہ وہ امام صاحب سے ہاتھ ملائے گا اور نہ ہی ان سے بولنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے امام صاحب چودہ برس کے لئے گم ہو جائیں گے............ جب بہت عرصہ تک تسلی بخش جواب نہ ملا تو لوگوں میں امام صاحب سے ہاتھ ملانے کی خواہش ہوئی۔ مگر ملا قادر نے یقین دلایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو امام صاحب کے خادم (جوان کے پاس کھڑے ہیں) پستول مار دیں گے (آخر کار اندر جا کر دیکھا تو) معلوم ہوا کہ بکرے کی کھال کو گھاس سے بھر رکھا ہے اور کچھ لکڑی کے ٹکڑوں اور بالوں کی مدد سی انسانی

شکل دے دی ہے۔ دریافت کرنے پر ملا قادر نے جواب دیا کہ سب کچھ صحیح ہے امام صاحب نے خود بطور معجزہ اپنے آپ کو ایک گھاس کے بھرے ہوئے مجسمے کی شکل لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیا۔[۱]

عینی مشاہد کا مکتوب: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے بڑی وضاحت سے اس حقیقت کا ذکر کیا جو سید صاحب کے متبعین اور متوسلین نے اسلام کے مقدس نام کو داغدار کرنے کے لئے کی لیکن ہندوستان کے مشہور عالم مولانا اشرف علی گلشن آبادی نے ایک عینی شاہد کا مکتوب اپنی کتاب تحفہ محمدیہ میں درج کیا ہے جسے ہم یہاں من وعن نقل کرتے ہیں تا کہ حقیقت واقعیہ صحیح طریقے سے آشکارا ہو جائے۔

مکتوب زین العابدین: بعد سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کے عرض ہے کہ یہ عاجز مولوی ولایت علی کی خدمت گاری کی برکت سے بدعتوں کو دین وایمان کے کاموں میں داخل کرنا برا جانتا ہے اور ایسے بدعات کو دفع کرنا سنت سمجھتا ہے۔ باوجود اس کے مرشدنا و مولانا ولایت علی صاحب کی سچائی اور دانائی پر جو عقل سے باہر ہے۔ بھروسہ کر کے منزل معلوم کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہاں پہنچا تو کوئی کام کاج کردار گفتار جو امام ہمام (سید احمد) کے لائق ہوئے۔ سو میں نے بالکل نہ دیکھا نہ سنا بلکہ کریم اللہ میواتی جو قاسم کذاب کے فریب میں آیا تھا۔ ملا قادر کی طرف سے قافلے میں آ کر یوں ظاہر کیا کہ امیر المؤمنین (سید احمد) ایسا فرماتے ہیں کہ

شیخ ولی محمد ایسا مردود بنا ہے کہ اگر رنجیت سنگھ قبر میں سے اٹھ کر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی۔ مگر شیخ ولی محمد کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ اور ایسا بھی فرماتے ہیں کہ

مسلمان ہونا بہت مشکل ہے اس زمانے میں ایک قاسم کو خدا نے مسلمان کیا ہے اور زین العابدین بہت اچھا آدمی ہے کہ اس نے اپنا تمام مال واسباب قاسم کے حوالے کیا اور عنایت علی سے حضرت (سید صاحب) ناخوش ہیں کہ اس نے اپنا سارا مال واسباب قاسم کے حوالے نہ کیا۔ اور اسی طرح کی بہت باتیں سن کر حیرت کرتا تھا اور قاسم کو پوچھتا تھا کہ جو شخص انبیاء علیہم السلام کا پرتو اپنے اخلاق رحمت اور عقل میں رکھتا ہو سو وہ ایسی سخت باتیں کرے۔ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتیں ہیں۔ اس لئے میں بہت متحیر ہوں قاسم جواب دیتا تھا کہ

حضرت ابھی حالت جذب میں ہیں۔

اور ضمیر الدین نے ایک مُہر امام (سید احمد) کے نام کی اپنی طرف سے کندہ کر کے ہندوستان سے ہمراہ لے گیا تھا۔ ایک دن کریم اللہ (ملا قادر) کی طرف سے آیا اور پیغام لایا کہ امام ہمام (سید احمد) اپنے نام کی مُہر مانگتے ہیں۔ قاسم نے وہ مُہر لے کر کریم اللہ کے ہاتھوں بھیج دی۔ چند روز کے بعد کریم اللہ نے وہ مُہر پھر لائی اور کہا کہ امام فرماتے ہیں کہ

میری طرف سے جا بجا خط بھیجیں اور یہ مُہر اس پر لگا دیں۔

اس وقت بھی اس عاجز نے کہا کہ اب تک امام کی زندگی میں لوگوں کو شک ہے اس واسطے خطوں کا لکھنا اور یہ مُہر اس پر لگانا امام ہمام کی رسائی عقل سے دور نظر آتا ہے کیونکہ سوائے نقصان کے اس میں کچھ نفع کی امید نہیں بعد دو روز کے پھر کریم اللہ آیا اور کہنے لگا کہ امام ناخوش ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

کیا زین العابدین مجھے عقل سکھاتا ہے۔

ملا قادر ایسا کہتے ہیں کہ دو صحابی جنگ بدر میں سے کبھی کہتے جنگ احد میں سے

کہ ایک کا نام ابن عباس اور دوسرے کا نام ابن خزیمہ تھا غیب ہو کر زمین کے نیچے ہدایت میں مشغول تھے۔اب جو امام کے ظہور کا زمانہ نزدیک آیا ہے۔ سو وہ دونوں شاہ گرداں کے پہاڑ پر پتھر کے تلے سے باہر نکل آئے اور امام ہمام (سید احمد) کی رفاقت میں آ بیٹھے۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جنوں کا بادشاہ مہا چین سے بلایا گیا ہے کہ اس کے تخت پر امام ہمام (سید احمد) سب اولیاء زماں کے ساتھ بیٹھ کر سلیمان علیہ السلام کی مانند ہوا پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔

اور عید الاضحیٰ کی اوّل ملاّ قادر ایسا کہتا تھا کہ سب اولیاء پیغمبر علیہ السلام کی ہمراہ امام ہمام (سید احمد) کے نزدیک آئے تھے اور امام ہمام (سید احمد) کو کہتے تھے کہ اٹھو کافروں کا لشکر بالاکوٹ پر آیا ہے امام نے فرمایا کہ
میں خدا کے حکم کے سوا نہ اٹھوں گا
آخر پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ اٹھو امام نے جواب دیا کہ غلام کو اتنا اختیار نہیں۔

ملا قادر نے یہ ایک پُتلا بنایا ہوا ہے دکھلانے کے اول سب لوگوں سے عہد و پیاں لیتا تھا کہ تم ہرگز مصافحہ اور بات چیت کا ارادہ مت کرو۔نہیں تو پھر امام ہمام چودہ برس تک غائب ہو جائیں گے۔تمام آدمی اپنے دل کی محبت سے اس بے جان جسم کو دیکھا کرتے اور دور سے سلام کیا کرتے۔اگرچہ کچھ جواب نہ سنتے تھے۔مصافحہ کا ارادہ بھی ہرگز نہ کرتے تھے جب چند روز اس طرح گزرے۔لوگوں کے دلوں میں شبہ پڑ گیا۔مصافحہ کا قصد کئے۔ ملا قادر سبھوں کو ڈرانے لگا کہ اگر کوئی بے اطلاع مصافحہ کرے گا تو میاں چشتی یا میاں عبداللہ صاحب اس کو طمانچے سے مار ڈالیں گے۔ ملا قادر نے دیکھا کہ میرا ڈرانا کچھ کام نہیں آتا اور لوگ مصافحہ کئے بغیر نہ چھوڑیں گے

اوراس پُتلے کی حقیقت حال کھل جائے گی۔تب یوں کہنے لگا کہ امام ہمام (سید احمد) ایسا فرماتے ہیں کہ

لوگوں نے میرے دیکھنے پر بغیر مصافحہ اور کلام کے صبر نہ کیا اوراس نعمت کا شکر بجا نہ لایا۔اس لئے حق تعالیٰ ان لوگوں سے ناراض ہے۔بعداس کے جب تک قافلے میں نہ آؤں گا تب تک پھر کسی سے ملاقات نہ کروں گا۔

پھر تو اس پتلے کا دیدار کسی کو میسر نہ ہوا۔الغرض چندروز کے بعد ملاتراب اور ایک دوشخص بزرگ ان کے ہمراہ کابل وقندھار سے وہاں آئے اور ملا قادر کو بہت سی طمع دے کر فریب کے شکنجے میں کھینچا۔آخرالامر ملا قادران کو دیدار دکھانے کے واسطے اس پتلے کے پاس لے گیا۔انہوں نے اچھی طرح دریافت کیا کہ
وہ پتلا بکری کے چمڑے کا اس میں گھاس بھرا ہوااور لکڑی بال وغیرہ کا بنایا ہوا تھا۔

اس عاجز نے یہ احوال قاسم کذاب سے پوچھا۔اس نے جواب دیا کہ سچ ہے اور یہ بھی امام ہمام کی کرامت ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں ایسی صورت میں دکھلائی دیئے۔بعداس کے ملا قادر کہنے لگا کہ حضرت مجھ سے ناخوش ہوئے اور میرے گھر کا آنا جانا موقوف کیئے۔بالفعل میاں چشتی صاحب کے یہاں کبھی کبھی آتے ہیں۔

پھر مولوی خدابخش نے گوجر نوجوان کو پکڑ کر مار پیٹ کر کے ان کا تاج اور پائے پوش فرخ آباد میں لائے ہیں۔

یہ ایک کرشمہ ان لوگوں کی ضلالت اور شرک وبدعت کا احوال ہے اوراس فقیر عاجز نے اول وہی بے جان جسم دیکھ کر خط لکھا تھا۔اور بہت اعتقاد صادق حضرت کی جناب میں ظاہر کیا تھا۔اب ان لوگوں کی گمراہی اور جھوٹا بہتان اظہر من الشّمس اور حق کے بعد ضلال آ گیا۔اس لئے خود کو ان کی گمراہی اور تہمت سے بچایا۔[۲]

مولانا ابوالکلام آزاد:

مولانا ابوالکلام آزاد سید صاحب کے بت بنانے کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چند چالاک اور دنیا پرست آدمیوں نے اپنی ذاتی غرض سے واقعی ایک پتلا بنایا تھا۔[۳]

مولانا آزاد نے بت بنانے کے حقیقت ہونے کا اعتراف کیا اور اسے چند چالاک اور دنیا پرست آدمیوں کی حرکت قرار دے کر سید صاحب کے متبعین کا دامن صاف کرنے کی کوشش کی لیکن مولانا اشرف علی گلشن آبادی کا نقل کردہ مکتوب بتاتا ہے کہ اس میں سید صاحب کے متبعین شریک تھے۔

اخفائے حقیقت کی بدترین مثالیں:

جناب غلام رسول مہر جو اخفائے حقائق میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اس مقام پر لکھتے ہیں۔

ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ مولوی محمد قاسم پانی پتی نے وادی کاغان کے کسی تاریک غار میں تین پیکر بنا کر کھڑے کر دیئے تھے ان میں سے بیچ کے پیکر کو سید صاحب اور ساتھ کے دو پیکروں میں سے ایک کو عبداللہ خادم اور دوسرے کو میاں جی چشتی بتایا کرتے تھے وقتاً فوقتاً غازیوں کو غار کے دہانے پر لے جا کر دور سے دکھا دیا جاتا تھا اور وہ مطمئن ہو کر لوٹ آیا کرتے تھے۔

میاں زین العابدین سرحد پہنچے اور انہوں نے پیکروں کے قریب پہنچ کر دیکھا تو جعل کا راز فاش ہو گیا۔ وہ سرحد سے لوٹ آئے اور عمر بھر مولوی محمد قاسم کو قاسم کذاب کہتے رہے۔

میں اس کہانی کی صدق وکذب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صرف اتنا

جانتا ہوں کہ مولوی محمد قاسم سید صاحب کے مخلص مرید تھے۔ ان کے بھائی اور والد میدانِ جنگ میں شہید ہوئے۔[۴]

یہاں مہر صاحب نے بڑی چالاکی سے حقیقت واقعیہ کو کہانی کا نام دے کر جرم کی اہمیت کم کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ درحقیقت مہر صاحب مجاہدین کو وہ مقام دینا چاہتے ہیں جس کے وہ مستحق نہیں۔ اسی لئے ان کی شرعی خامیوں پر الفاظ کا غلاف چڑھا کر انہیں مخفی رکھنے کی تگ ودو کرتے ہیں۔

اگر مہر صاحب کے ممدوح کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مسلمانوں کو کافر کہتا انہیں بے گناہ قتل کرتا۔ ان کی عورتوں سے زبردستی نکاح کرتا۔ انہیں منافق وباغی ٹھہراتا، ان کے مال کو مال غنیمت سمجھتا تو یقیناً مہر صاحب اور ان کے ہم عقیدہ افراد اسے خارج از اسلام کر دیتے۔ بارگاہ الٰہی کا مردود قرار دیتے۔ چونکہ یہ تمام کام مہر صاحب کے ممدوح سید صاحب اور ان کی رفقاء نے انجام دیئے ہیں۔ اس لئے مہر صاحب تاویل بے جا سے کام لے کر سید صاحب کو امیر المؤمنین اور ان کے رفقاء کو اعلیٰ قسم کا مسلمان ثابت کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

۱۔ ڈاکٹر صادق حسین۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ص ۷۶

۲۔ سید اشرف علی گلشن آبادی۔ تحفہ محمدیہ ص ۲۱ تا ۱۸

۳۔ عبدالرزاق۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی ص ۳۵۷

۴۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۸۱۴

﴿پیش گوئیوں کی حقیقت﴾

سید صاحب کوالہام ہوتے تھے۔اور وہ اپنے الہامات کا ذکر بار بار تقریر وتحریر میں کرتے اور لوگوں کو خوب ''سبز باغ'' دکھاتے۔سادہ لوح مسلمان خوش بیانیوں اور دلفریب باتوں کے بھنور میں آ جاتے اور سید صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیتے لیکن سید صاحب کی الہامی پیش گوئیوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو پوری ہوئی ہو مثلاً

ا)۔سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ جن سے معرکہ بالاکوٹ سے (پہلے) سید صاحب نے اپنی غیبوبیت کی پیش گوئی کی تھی۔[ا]

سید صاحب کے غیب ہونے کی پیش گوئی وقت نے خود باطل کردی۔تاہم دیر تک سید صاحب کے خلفاء اس کی اشاعت کرتے رہے۔بہر حال اس کھلے ہوئے تضاد میں سے ایک کو ماننا پڑے گا۔یا سید صاحب کذاب تھے یا ان کے خلفاء۔

۲)۔اکثر مؤلفوں کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ فتح پنجاب کے الہام کا آپ کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اس کو سراسر صادق اور ہونے والی بات سمجھ کر بارہا فرمایا کرتے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے کہ اس الہام میں وسوسہ شیطانی اور شائبہ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ آئے گی۔[۲]

فتح پنجاب کا الہام ایسا عظیم الشان تھا کہ اس میں وسوسہ شیطانی اور شائبہ نفسانی ذرا بھر بھی نہ تھا اور اس فتح سے پہلے موت بھی نہیں آ سکتی۔فتح پنجاب تو کیا سرحد بھی مفتوح نہ ہوسکا۔کہ سید صاحب ضروری سامان لے کر آسمان پر چل دیئے۔جب ایسا عظیم الشان الہام جھوٹا ہو گیا اور اس کے جھوٹا ہونے پر مزید کسی گواہی کی

حاجت نہیں ۔تو کیا سید صاحب کو بھی کذاب اور جھوٹا کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ محققین اور سید صاحب کے مداحوں کو غیر جانبدار ہو کر سوچنا چاہیے۔

۳)۔سید صاحب اپنی ہمشیرہ (یعنی والدہ سید محمد یعقوب) سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ

''اے میری بہن میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو نہ ہو کر ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو جائے گی اللہ رب العزت مجھے نہیں اٹھائے گا۔اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف کرے کہ سید صاحب میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا تو تم اس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا۔ کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پورا کر کے مارے گا''۔[۳]

نہ ہندوستان کا شرک ختم ہوا اور نہ ایران کا رفض ، نہ چین کا کفر اور نہ افغانستان کا نفاق کہ سید صاحب خود ختم ہو گئے۔سید صاحب فرماتے ہیں کہ ''اللہ رب العزت نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے''۔اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا براہ راست خود وعدہ کیا ہو، یا فرشتہ کے ذریعے یقین دلایا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو وعدہ یقیناً پورا ہو جاتا۔لیکن یہ ''ٹیچی ٹیچی'' کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔تاہم سید صاحب سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی وفا نہ کیا۔ اس طرح ان کی یہ پیش گوئی بھی جھوٹی ہوگئی اور ''زمرہ کذابین'' میں شامل ہو گئے۔

---

۱ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمدی ص ۲۹۰ ۲ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمدی ص ۲۹۱

۳ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔سوانح احمدی ص ۱۷۱

خلفاء کا غیر اسلامی کردار

سید صاحب کے انتقال کے بعد ان کے خلفاء جانشین ہوئے۔تو ان کا ''رفع الی السماء'' کیا۔ پھر بت بنا کر ایک غار میں رکھا اور سادہ لوح مسلمانوں سے یہ کہہ کر کہ حضرت غار میں روپوش ہیں مناسب وقت پر ظہور فرمائیں گے۔ مال وزر لوٹتے رہے۔اس طرح ہر آنے والا خلیفہ پہلے سے دو قدم آگے ہی رہا۔

نعمت اللہ شہید اور رحمۃ اللہ غازی کی امامت:

مولانا محمد میاں ان دونوں امیروں کا ذکر بڑے اعزاز واکرام سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مولانا عبدالکریم کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ کے پوتے نعمت اللہ خان امیر بنائے گئے۔جن کو کسی مسلمان ہی نے شہید کر دیا۔پھر مولانا عبداللہ کے دوسرے پوتے رحمۃ اللہ خان عازی منصب امامت پر فائز ہوئے۔[۱]

امیر نعمت اللہ کا تعارف:

مولانا محمد میاں نے امیر نعمت اللہ کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے وہ مظلوم تھے اور شہادت کا مرتبہ بھی دے دیا۔لیکن ان کا تعارف ایک عینی شاہد اہل حدیث سے سنیے۔

جب میں سرحد پہنچا تو اس جماعت کی عنان اقتدار امیر انعمت اللہ کے ہاتھوں میں تھی۔امیر نعمت اللہ مرحوم ایک بھاری بھرکم ،خوبصورت ،وجیہہ دراز قامت نوجوان تھے۔ گفتگو میں نہایت شائستہ، متین اور سنجیدہ تھے، بڑے زیرک اور مردم شناس آدمی تھے۔ان کے خطبات کافی دل نشیں ہوتے تھے خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی ،سر پر خوبصورت ستھرے پٹے رکھے ہوئے تھے لباس میں پٹنہ اور یو پی کا قدیم غرارہ اور لمبا

کرتہ، تکمہ دار صدری پہنتے تھے۔ سر پر عمامہ اور ہاتھ میں نفیس چھڑی، مسلمان امراء و مشائخ کی طرح عورتوں کے بیحد شوقین تھے۔ تین تو ان کی نکاحتأ بیویاں تھیں اور دس بارہ نہایت خوبصورت لڑکیاں بطور خادماؤں کے رکھتے تھے۔[۲] یہ خلفاء کا کردار تھا۔ عوام کا کیا عالم ہوگا۔

بیت المال پر اجارہ داری: ۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

''عمارت میں مجاہدین کا بیت المال تھا۔ جس کی کنجی امیر صاحب کے پاس رہتی تھی۔ کسی شخص کو بیت المال کے متعلق سوال کرنے کا حق نہ تھا میں نے سنا ہے کہ بعض گستاخوں نے بیت المال کے متعلق سوال کرنے کی جسارت کی مگر اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ رات کو چپکے سے امیر صاحب کے معتمد انہیں ختم کر دیتے تھے اور پھر اس کا ذکر بھی کوئی شخص نہ کر سکتا تھا۔[۳]

یہ اسلامی حکومت کا بیت المال تھا اور یہ امیر المجاہدین تھے۔ منصب امامت سے کیا خوب مزے لئے۔ زن اور زر دونوں امیر کے ہاتھ میں ہیں۔

امیر کی اسلام کش فوج:۔ امیر نعمت اللہ جو ''امیر المجاہدین'' تھے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کیسے کر رہے تھے۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

''بعض لوگ علیحدہ اپنا کام کرتے تھے اور وہ اپنے کھانے وغیرہ کا الگ انتظام کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے علاوہ ایک خاص حلقہ ان لوگوں کا تھا جو امیر صاحب کی حالی وموالی تھے۔ انہیں اپنی خدمات کی صلے میں امیر صاہب ہمیشہ داد ودہش سے نوازتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ تو امیر صاحب کے جانثار خدام میں سے تھے۔ جو امیر صاحب کے ادنیٰ اشارے پر ہر قسم کے جرائم کرنے پر آمادہ وتیار رہتے

تھے۔ مثلاً اگر امیر صاحب کی خادماؤں میں سے کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اس کے بچے کو پیدائش کے بعد گلا گھونٹ کے چپکے سے دریا برد کر دینا امیر صاحب کی عادت تھی کہ ان خادماؤں کو اکثر بدلتے رہتے تھے۔ جو خادمائیں اس طرح الگ کی جاتی تھیں انکی شادیاں انہی لوگوں میں سے کسی ایک سے کردی جاتی تھی اور اسے نہایت عمدہ جہیز اور ماہوار خرچ مل جاتا تھا اور یہ امر اس درجہ افسوسناک تھا کہ ان میں سے جو لڑکی غیر معمولی خوبصورت ہوتی وہ شادی کے بعد بھی امیر صاحب کی توجہات کا مرکز بنی رہتی۔[۴]

مولوی محمد علی قصوری عینی شاہد ہونے کے ساتھ عقیدتاً اہل حدیث بھی ہیں۔ ان کے والد مولوی عبدالقادر قصوری بھی مشہور اہل حدیث رہنما تھے۔ اس لئے ان کی یہ خودنوشت سید صاحب کی تحریک کو سمجھنے کے لئے نہایت معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم یہاں ''امیر المجاہدین،، کے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ بات روز روشن کی طرح واضح ہے لیکن ایسے لوگوں پر دکھ ہوتا ہے جو حقائق کو جاننے اور سمجھنے کی باوجود مصلحتوں سے کام لیتے اور حق کو چھپاتے ہیں۔

وجود زن سے بہار:۔ سید صاحب خود تین بیویوں کے شوہر تھے۔ اسی طرح مجاہدین کی بھی کئی کئی بیویاں تھیں امیر نعمت اللہ شہید کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تین نکاحاً بیویوں کے علاوہ دس بارہ دوشیزاؤں کو پہلو میں رکھتے تھے۔ اسی طرح آدمی کو زبردست اور زیربار کرنے کے لئے کئی کئی نکاح کرا دیتے تھے۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

''امیر نعمت اللہ نے مولوی محمد موسیٰ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے پہلے ان کی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے کردی۔ اس کے چند ماہ بعد ایک دوسری خوبصورت لڑکی

سے ان کی شادی کر دی۔اب ان کی دو بیویاں ہو گئیں جب میں پہنچا تو ان کی چھوٹی بیوی
کے ہاں ایک لڑکا بھی تولد ہو چکا تھا اور مولوی صاحب اب پورے متاہل ہو گئے تھے۔

امیر نعمت اللہ نے ان کے لئے خاصا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور وہ بظاہر ان
کے سلوک سے بہت خوش تھے''۔[۵]

انہی مولوی صاحب سے جب مولانا قصوری کی ملاقات ہوئی تو باہم یہ گفتگو ہوئی۔

مولوی صاحب نے سب سے پہلے امیر نعمت اللہ کے خلاف شکایت کا ایک
طومار پیش کیا۔ان کی بدعنوانیاں، ان کا عورتوں کے ساتھ شغف، ان کی جہاد سے
غفلت واعراض، جماعتی فنڈ کو اپنے اغراض ومشؤمہ کی تکمیل کیلئے بے دریغ استعمال کرنا
،سب پیش کئے اور کہا مجھے تو شرم آتی ہے کہ میں پنجاب میں اس شخص کے متعلق اتنا
جھوٹا پروپیگنڈا کرتا رہا اور لوگوں کو جماعت کے فرضی کارناموں کی داستانوں سے اپنی
طرف مائل کرتا رہا۔ یہاں آ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پنجاب میں حالت خواب
میں تھا اور اب آنکھیں کھلی ہیں تو ایک بھیانک منظر سامنے ہے جماعت مجاہدین
اخلاقی طور پر مر چکی ہے۔اس کی عملی قوتیں فنا ہو چکی ہیں۔اس کے دو حصے ہیں۔ایک
تو خوشحال طبقہ جو''امیر المجاہدین'' کے متوسلین پر مشتمل ہے وہ لوگ نہایت سخت اوباش،
بدچلن اور خودغرض ہیں۔ انہیں تو صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ دوسرا
طبقہ عام لوگوں کا ہے جو بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔انہیں قوت
لایموت بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔تیل کی بگھاری ہوئی مسور کی دال اور مکا یا جوار
کی روٹی ان کی غذا ہے۔ان لوگوں کو مذہب کی افیون پلا کر خوابِ خرگوش میں مبتلا کر دیا
گیا ہے۔[٦]

یہ حقائق سید صاحب کی جماعت کے مجاہدین کے جانثاروں کی زبان وقلم سے صفح

قرطاس پر رقم ہوئے ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے معتقدین کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ورنہ الزام کا الزام ہو جاتا۔ سید صاحب کی تحریک کے روح رواں بول رہے ہیں۔

مزید سنیے۔ مولوی محمد موسیٰ نے کہا۔

''امیر المجاہدین نے کمال ہوشیاری سے میری دو شادیاں کر دی ہیں۔ دونوں خوبصورت اور جوان ہیں اور ہر طرح سے نہایت اچھی بیویاں ہیں اور اب مجھے دنیاوی زندگی سے ان کی بدولت اتنی دل بستگی ہوگئی ہے کہ امیر المجاہدین کے خلاف لب نہیں ہلا سکتا۔ کیونکہ یہ شخص ایسا بے اصول ہے کہ جو شخص ذرا بھی بغاوت کا میلان ظاہر کرتا ہے اسے فی الفور قتل کروا دیتا ہے۔ اور مجھے یہ رنج ہوتا ہے کہ میں اگر اس طرح قتل ہو جاؤں گا تو میری بیوی بچے کیا کریں گے۔[۷]

جناب غلام رسول مہر جن کو سید صاحب اور جماعت مجاہدین سے بڑا عشق ہے یہ ساری باتیں پی گئے۔ سرحدی مسلمان تو سید صاحب سے اختلاف کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے لیکن سید صاحب کے ایسے بدکردار، قاتل، زراندوز، حلوہ خور اور ملت مسلم کے دشمن جانشینوں کا عقیدہ چونکہ وہابیانہ تھا اس لئے ان کی صحت متاثر نہ ہوئی۔

سید صاحب کے ان مجاہدین کی سیرت و کردار اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ حسنہ کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ جماعت مجاہدین کے ''امیر المجاہدین'' نے راجہ اندر اور چنگیز خان کی عیاشیوں اور ظلم و بربریت کو بھی مات کر دیا تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ان کی مذمت اور برائی کی جاتی لیکن وہابی ہونے کے ناطے ایسے بدکردار لوگوں کی مدافعت اور حمایت کی جاتی ہے اور پھر خود کو مسلمان کہا جاتا ہے اور صاحب شریعت افراد کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے اور ملامت کا کوئی لمحہ زندگی میں نہیں آتا۔ یہ بھی شاید

ذکر''امیر المؤمنین''اور''تذکرہ مجاہدین'' کی ایک کرامت ہے؟

امیر المجاہدین پر نکتہ چینی کفر ہے:۔ اسلام میں امیر اور رعایا میں سے کوئی بھی باز پرس سے مبرا نہیں لیکن سید صاحب کی جماعت مجاہدین کے امیر ہر اعتراض اور نکتہ چینی سے بالاتر ہیں۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں۔

''بیعت کرتے وقت انسان کو اطاعت امیر، راز داری، افراد جماعت کو بھائی اور تمام ان لوگوں کو جو جماعت سے باہر ہوں حقیر سمجھنا یا کم از کم اجنبی خیال کرنے کا عہد لیا جاتا ہے۔ اطاعت امیر کا مطلب یہ تھا کہ امیر کی ذات ہر قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر خیال کی جائے، اس کے عیوب کو حسنات سمجھا جائے اور اس کے خلاف کسی قسم کی بری بات اپنی زبان سے نہ نکالی جائے۔ کیونکہ اطاعت امیر کے انکار سے فسخ بیعت لازم آتا ہے اور فسخ بیعت کفر اور الحاد کے برابر ہے۔[۸]

دوسرے مسلمانوں کو اپنے سے حقیر سمجھنا اور امیر پر جائز نکتہ چینی کو کفر کہنا اسلامی کردار کے سراسر منافی ہے لیکن تحریک بالاکوٹ کے حامی جناب غلام رسول مہر اور ان کے دوسرے ہم خیال ''کور چشمی'' کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان شرعی حدود کی پائمالی کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وہابی مجاہدین اور کمیونسٹ:۔ مولوی محمد علی قصوری وہابی مجاہدین اور کمیونسٹوں میں قدر مشترک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ان (مجاہدین) کے اعلیٰ کیریکٹر ہندوستانی مراکز کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس قدر امین اور بے غرض ہونے کہ وہ جماعت کے لئے حیرت انگیز جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان اضداد کا پتلا ہے۔ یہ تضاد میں نے اکثر بہترین کمیونسٹ ورکروں میں بھی دیکھا ہے اور مجھے

حیرت ہوتی ہے کہ ایک بے غرض، ایثار کا پتلا، امین ودیانت دار شخص کیوں کرایسی جماعت کیلئے جھوٹا پروپیگنڈا کرنے سے نہیں جھجکتا۔ بلکہ اسے عین ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔[۹]

ہم تو کچھ عرض نہیں کرتے۔ عینی شاہد اور وہ بھی اہل حدیث کہہ رہا ہے کہ وہابی مجاہدین کمیونسٹوں کی طرح جماعت کے لئے حیرت انگیز جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ جھوٹ بولنا اور پھر اس کی تشہیر دوہرا جرم ہے لیکن ارباب وہابیت کورچشمی کا مظاہرہ کریں تو ہم ''قہر درویش بر جان درویش'' کے علاوہ کیا کہہ سکتے ہیں۔

امیر المجاہدین کا ذریعہ آمدنی:۔ آج سید صاحب کے معتقدین بڑی شدومد سے مسلمان علماء ومشائخ کے نذرانوں پر اعتراض کرتے ہیں اور نشانہ بناتے ہیں لیکن سید صاحب کے نذرانے انہیں نظر نہیں آتے اسی طرح مجاہدین کے ہر عیب میں انہیں حسن نظر آتا ہے اور امیر المجاہدین کا تو معاملہ ہی نرالا ہے۔ مولوی محمد علی قصوری امیر کی آمدنی کے باری میں لکھتے ہیں۔

ہندوستان میں جگہ جگہ مختلف ادارے تھے۔ جو بظاہر تعلیمی مشاغل میں منہمک تھے اور مدرسوں اور خیراتی اداروں کے ذریعے کافی رقم جمع کرتے تھے۔ اس رقم کا ایک معتد بہ حصہ سرحد پار امیر المجاہدین کے پاس جہاد کے لئے پہنچ جاتا۔[۱۰]

زکوٰۃ وصدقات کی وہ رقم جو یتیم اور مسکین طلبہ کے نام سے ''وہابی مولوی'' جمع کرتے تھے اور جہاد کے بہانے امیر المجاہدین کے پاس سرحد پہنچادیتے۔ جس سے امیر المجاہدین عورتوں کا شوق پورا کرتے دس دس خادماؤں کو بغیر نکاح کے اپنے تصرف میں لاتے۔ بیت المال میں ناجائز تصرف کرنے پر اعتراض کرنے والوں کو دریا برد کراتے کیا ایسے مدارس کو امداد واعانت کرنی درست ہے جو مندرجہ بالا کردار کے حامل ہوں۔

امیر رحمت اللہ غازی کا تعارف:۔ امیر المجاہدین رحمۃ اللہ غازی کا تعارف کراتے

ہوئے مولوی محمد قصوری رقم طراز ہیں۔

"رحمۃ اللہ اپنے بھائی کی طرح بہت بدچلن اور آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اگر امیر نعمت اللہ کو لڑکیوں کی رغبت نے معطل کر رکھا تھا تو اسے نوجوان لڑکوں کی محبت نے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھار انہیں روپیہ کی ضرورت ہوتی اور امیر نعمت اللہ کہیں انکار کر دیتا تو بس جماعت کے احاطہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ رحمۃ اللہ اپنے بڑے بھائی کو خوب مغلظات سناتے اور روپیہ لے کر ہی ٹلتے۔ ہم لوگ ان لڑائیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ مگر کیا کرتے۔

میں نے کئی دفعہ امیر صاحب سے کہا کہ رحمۃ اللہ کا خاص وظیفہ مقرر کر دیجئے، مگر وہ کہتے کہ رحمۃ اللہ اوباش ہے۔ کوئی وظیفہ اس کی روز افزوں ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم یہ محض بہانہ تھا یا اس میں واقعیت کا بھی کچھ شائبہ تھا۔[۱۱]

یہ تھا سید صاحب کے ان دو خلفاء کا کردار جن کو مولانا محمد میاں نے شہید اور غازی کے لقب سے نوازا تھا اگر شہید اور غازی ایسے بدکردار لوگوں کا نام ہوتا ہے تو اہل لغت کو ان کے معنی میں وسعت پیدا کرنی پڑے گی۔

صاحبزادہ برکت اللہ:۔ شہید اور غازی کے بعد صاحبزادہ برکت اللہ کا تعارف حاصل کریں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ "ایں خانہ ہم آفتاب است" مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں "امیر نعمت اللہ کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑا لڑکا برکت اللہ تھا جو غالبا اس وقت نو سال کا تھا۔ لڑکا خاصا خوبصورت اور بگڑا ہوا صاحبزادہ تھا۔ ہر وقت دو تین اوباش نوجوان اسکی مصاحبت میں رہتے اسلئے اس کا آوارہ ہونا لابدی تھا۔[۱۲]

یہ تھے شہید اور غازی کا لقب پانے والے اور ان کی اولاد۔ اگر اب بھی لوگ

تحریک بالاکوٹ کو اسلامی تحریک کا نام دیں تو کتمان حق کی اس سے بڑی مثال اور کوئی نہ ہوگی۔

۱۔ مولانا محمد میاں۔ علماء ہند کا شاندار ماضی۔ حصہ سوم ص ۷۳

۲۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۰۸

۳۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۰۹

۴۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۰

۵۔ محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص

۶۔ محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۳،۱۱۴

۷۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۴

۸۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۹۹

۹۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۲۱

۱۰۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۹

الف ۱۱۔ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین ص ۵۱۰

ب ۱۱۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۰

الف ۱۲۔ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین ص ۳۹

ب ۱۲۔ مولوی محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۱

﴿تاریخ میں قیاس آرائیاں﴾

تاریخ اسلام میں بے شمار افراد ایسے گزرے جو ''تحریف فی التاریخ'' کے ناطے پہچانے جاتے ہیں۔ان لوگوں نے بہت سے پاکباز نفوس قدسیہ کے کردار کو مسخ کیا اور کئی ننگِ اسلام کو ''قدسی صفات'' بنا کر پیش کر دیا لیکن مثل مشہور ہے کہ ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد'' آخر حق ان ہی کی زبان سے نکل آیا۔

جناب غلام رسول مہر کا شمار بھی ''واضعانِ تاریخ'' میں ہوتا ہے۔انہوں نے بڑی دوراندیشی اور کمال ہوشیاری سے سید احمد بریلوی کو مصلح اور ان کی ''مسلم کش'' تحریک کو ''تحریک اصلاح مسلمین'' بنا دیا۔ جناب مہر کی تاریخ میں یہ فکری آمیزش ایک افسوس ناک امر اور ان کی زندگی کا ''سیاہ باب'' ہے کہ حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت کا روپ دے دیا اور اس غلطی کا اعتراف انہیں خود بھی ہے۔ لیکن سندانِ عقیدت کے سامنے پابہ زنجیر ہیں لکھتے ہیں۔

میں مجاہدین کی شان وآبرو بہرحال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ بعض سابقہ بیانات اور توجیہات سے عین مطابق نہ ہو۔[۱]

مہر صاحب ہر حال میں مجاہدین کی آبرو قائم رکھنے کے قائل ہیں اگرچہ وہ اس آبرو کے مستحق نہ ہیں۔ یہ عقیدت تاریخ میں اخفائے حق اور بددیانتی پر مجبور کرتی ہے۔اس اخفائے حق کی واضح مثال مہر صاحب اپنے قلم سے خود لکھتے ہیں۔

مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ کی کتاب کا وہ حصہ نہ دیکھ سکا جو سرکاری دستاویزات پر مبنی ہے۔آپ نے یقیناً دستاویزوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہوگا لیکن ایک بات عرض کر دوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات یہ دستاویزیں غلط فہمی کا باعث

بن جاتی ہیں۔[۲]

آج تک پوری دنیا کے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ دستاویزات سے بڑا ثبوت کوئی نہیں ہوسکتا لیکن مہر صاحب فرماتے ہیں کہ دستاویزیں بعض اوقات غلط فہمی کا باعث بن جاتی ہیں۔ غالباً ''بعض اوقات'' کی قید اس لئے لگائی کہ صرف سید صاحب کے معاملے میں دستاویزیں غلط فہمی کا باعث ہیں۔ دوسرے مقامات پر قابل استناد ہیں۔

مہر صاحب کی اس کیفیت کے انکشاف کے بعد کیا کوئی حق پسند ان کو غیر جانبدار مؤرخ تسلیم کرلے گا؟ سید صاحب کے سلسلہ میں تو مہر صاحب نے خود کہانیاں گھڑی ہیں اور ان پر ردے چڑھائے ہیں اپنے قیاس سے بے شمار اضافے کئے ہیں۔ ''سید احمد شہید'' کے کئی مقامات پر مہر صاحب نے ''تاریخ میں قیاس'' کا خود اقرار کیا ہے لکھتے ہیں۔

۱)اس کے بعد معلومات کے ذخائر میں دفعتہً ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ڈمگلہ اور شنکیاری کی لڑائیاں کس بنا پر پیش آئیں قیاس سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔[۳]

کیا تاریخ میں قیاس نام کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہاں تو ماضی کی داستان رقم ہوتی ہے اور بس۔

۲)حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد سید صاحب ہمہ تن جہاد کیلئے مشغول ہو گئے جس کے لئے وہ اپنی حیات گرانمایہ وقف فرما چکے تھے اس دور کی مشغولیتوں کا کوئی مرقع مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن یقین ہے کہ ان کے داعی شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ دورے کرتے ہوں گے۔[۴]

حیرت ہے کہ اس دور کا کوئی مرقع بھی سامنے نہیں پھر بھی لکھتے ہیں کہ یقین ہے کہ ان کے داعی .... دورے کرتے ہوں گے۔ چونکہ معاملہ سید صاحب کا ہے اس لئے بن دیکھے یقین کرنا مہر صاحب کے لئے عین اسلام اور عین ایمان ہے۔

۳) داعیوں کے سرخیل مولانا شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی تھے۔ یقین ہے کہ وہ اصلاح عقائد واعمال کے لئے وعظ بھی کہتے ہوں گے۔[۵]

یہ ''ہوں۔گے ہونگے'' کی اصطلاح تاریخ میں نہیں ہوتی تاریخ ماضی کا مرقع ہوتی ہے۔قیاس کی گنجائش نہیں رکھتی۔

۴) یقین ہے نواب امیر خان نے اسلحہ اور دوسرے ساز وسامان کے علاوہ نقد روپیہ بھی خاصی مقدار میں سید صاحب کی نذر کیا ہوگا۔[۶]

''یقین اور ہوگا'' دونوں کا کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں کے مفہوم الگ الگ ہیں لیکن یہاں تو عشق اور عقیدت کا معاملہ ہے۔ سنا ہے دونوں ہی اندھا کر دیتے ہیں۔

۵) لاہور کی (سکھ) حکومت ایک بے نوا سید کے انتباہ کو کب خاطر میں لاسکتی تھی؟ تاہم پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس پر اضطراب طاری ہوگیا ہوگا۔[۷]

یہ ''یقین وثوق اور ہوگیا ہوگا'' کے الفاظ قابل غور ہیں اور مہر صاحب کی عدم بصیرت پر دلیل ناطق ہیں۔

۶) مجھے یقین ہے کہ بعد میں بھی ان سب کو یا ان میں سے بعض کو ضرور مکاتیب بھیجے ہوں گے۔ اگرچہ وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔[۸]

یقین بھی ہے اور پھر بھیجے ہوں گے۔ مہر صاحب کی تحقیق کو داد دینا پڑتی ہے

مزید یہ کہ وہ خطوط محفوظ بھی نہیں ہیں۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ عشق   آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لئے

۷) مجھے یقین ہے کہ انہوں نے عشر وصول کرنے کے بعد بیت المال سے ان کیلئے مشاہروں کا انتظام سوچ لیا ہوگا۔ یہ بات خیال میں نہیں آئی کہ اس گروہ کو صدیوں کے وسائل سے محروم کر کے تسکین وتلافی کیلئے کوئی متبادل ذریعہ تجویز نہ کیا ہو۔[۹]

چونکہ سید صاحب سے عقیدت ہے اس لئے مہر صاحب ان پر ظلم اور ناانصافی کے گھناؤنے الفاظ کا بوجھ ڈالنے سے خیال اور قیاس کے بہانے گریزاں ہیں۔

۸) پچاس ساٹھ آدمی ان کے ساتھ کر دیئے۔ ان میں اکثر ارباب ہی کے آدمی ہوں گے۔[۱۰]

کیا خوب تاریخ لکھی جارہی ہے۔ ماشاءاللہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مہر صاحب کے نزدیک ہوں گے۔ ہوا ہوگا، کیا ہوگا، ہوگیا ہوگا، تاریخ کے بنیادی ستون ہیں ان کے بغیر تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔

۹) میرا خیال ہے کہ سید صاحب نوشہرہ میں بھی ایک دودن ضرور ٹھہرے ہوں گے۔[۱۱] خیال وقیاس سے افسانے گھڑے جاتے تھے۔ تاریخ نہیں لکھی جاتی۔

۱۰) سارے لشکر اسلام میں چونکہ یہی ایک ہاتھی تھا۔ اس لئے بہت نمایاں ہوگا۔ اوریا محمد خان نے سکھوں کو بتادیا ہوگا کہ سید صاحب ہاتھی پر سوار ہیں۔[۱۲]

۱۱) مدینہ منورہ میں کئی ماثر بتائے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ سید صاحب ان تمام مقامات پر پہنچے ہوں۔[۱۳]

(۱۲) غالباً باہم یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جب اچھے مرکز کا بندوبست ہوجائے تو پیر صاحب بھی وہاں پہنچ جائیں۔[۱۴]

(۱۳) غالباً سید صاحب نے اس مقام پر بھی چوکی مقرر فرمادی تھی۔[۱۵]

(۱۴) سید صاحب پر پے در پے بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ مولانا (شاہ اسمعیل) انہیں سنبھالنے کے تردد میں بھی منہمک ہوں گے۔[۱۶]

(۱۵) خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ مسجد مجاہدین کی چوکی کے مقام پر بعد میں بطور یادگار بنادی ہو۔[۱۷]

(۱۶) غالباً پوری جماعت کے ساتھ ایک دو گھوڑے بھی تھے۔[۱۸]

اب ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مہر صاحب نے افتراء اور اخفاء حقائق کی بدترین مثال قائم کر کے اپنی شخصیت کو مجروح کرلیا ہے۔

۱؎ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ افادات مہر ص ۲۳۱
۲؎ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ افادات مہر ص ۱۰۳
۳؎ غلام رسول مہر سید احمد شہید ص ۴۲۴
۴؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۳۴
۵؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۳۴
۶؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۷۶
۷؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۳۳
۸؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۰۴
۹؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۵۹۸
۱۰؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۴۵۰
۱۱؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۶۸
۱۲؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۷۹
۱۳؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۲۷
۱۴؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۹۱
۱۵؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۲۲۷
۱۶؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۳۷۸
۱۷؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۷۵۰
۱۸؎ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید ص ۱۶۴

﴾مآخذ و مراجع﴿

ا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید حصہ دوم۔ مکتبہ القادر لاہور

۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ ارواح ثلاثہ۔ مکتبہ امداد الغربا سہارنپور ۱۳۷۰ھ

۳۔ مولانا اشرف علی عبدالفتاح۔ تحفہ محمدیہ۔ مطبع فضل الدین کھمکر بمبئی ۱۲۶۸ھ

۴۔ پیام شاہ جہان پوری۔ شہادۃ گاہ بالاکوٹ۔ ادارہ تحقیق تاریخ لاہور

۵۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات۔ اسلامی اکادمی لاہور

۶۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان (مترجم) مطبوعہ ملتان

۷۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۵ء

۸۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ افادات مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۹۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ تذکرۃ الرشید۔ مکتبہ بحر العلوم جونا مارکیٹ کراچی

۱۰۔ مولانا عبدالحکیم شرف قادری۔ تذکرہ اکابر اہلسنت۔ مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۷۵ء

۱۱۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری۔ الدر المنثور بحوالہ تبصرہ بر تذکرہ پیرانِ پگارہ

۱۲۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی۔ چٹان پریس لاہور

۱۳۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ مقدمہ کابل میں سات سال۔ سندھ ساگر اکادمی لاہور

۱۴۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۱۵۔ غلام رسول مہر۔ جماعت مجاہدین شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۱۶۔ مولانا فضل حسین بہاری۔ الحیات بعد الممات۔ مکتبہ سعودیہ حدیث منزل کراچی ۱۹۵۹ء

۱۷۔ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مقالات سرسید۔ مجلس ترقی ادب لاہور

۱۸۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی۔ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۸ء

۱۹۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ تواریخ عجیب۔ سلمان اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء

۲۰۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ مکتوبات سید احمد شہید۔ منڈی بہاؤالدین گجرات

۲۱۔ منشی محمد حسین محمود۔ فریاد مسلمین۔ طبع ریاض ہند امرتسر

۲۲۔ مولانا محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان۔ انجمن ترقی اردو کراچی

۲۳۔ مولانا محمد علی بریلوی۔ مخزن احمدی۔ مکتبہ حبیبیہ داتا دربار لاہور ۱۹۷۹ء

۲۴۔ مولانا محمد میاں۔ علماء ہند کا شاندار ماضی۔ مکتبہ محمودیہ لاہور

۲۵۔ سید مراد علی علیگڑھ۔ تاریخ تناولیاں۔ مکتبہ قادریہ لاہور

۲۶۔ مرزا حیرت دہلوی۔ حیات طیبہ۔ اسلامی اکادمی لاہور ۱۹۷۶ء

مطبوعات

ضیاء العلوم پبلی کیشنز

راولپنڈی - پاکستان